قرآن فہمی کے اصول
(علمی کام کا جائزہ)

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت ☆

اللہ جل شانہ نے کائنات انسانی کی رہنمائی کے لیے اپنا آخری اور مکمل پیغام قرآن حکیم کی شکل میں جناب محمد ﷺ پر اتارا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے کچھ فرائض بھی مقرر فرمائے۔

۱۔　پیغام کا پہونچانا
۲۔　پیغام کی تشریح و تعبیر

اس امر کا اشارہ اس آیت مبارکہ میں ملتا ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبیّن للناس مانزل الیهم لعلّهم یتفکرون (النحل:٤٤)

آنحضرت ﷺ نے جس طرح لوگوں کو قرآن حکیم پہونچایا اس کے ساتھ اس کی حسب موقعہ تشریح و تعبیر کر دی، آپ نے یہ تمام فرائض بتمام و کمال سرانجام دیئے۔ جہاں تک نفس قرآن اور اس کے احکام و قصص کا تعلق ہے یہ دنیا کی آسان ترین کتاب ہے جس کی طرف اس آیت ربانی میں اشارہ ملتا ہے۔

ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدّکر (١٧:٥٤)

☆　پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

اس کتاب کی عجیب کیفیت ہے ہر ایک دل پر جلوہ فگن اور ہر ایک دماغ پر ضوء فشاں ہے۔ اس کی حلاوتیں ہر وجدان میں گھر کرتی ہیں۔ اس کی تنویرات کو ہر روح قریب تر پاتی ہے لیکن اس کے باوجود انسانی فہم و فراست اس کی کنہ پانے سے عاجز و درماندہ ہے۔ اس لیے جہاں تک اس گہرائی و گیرائی کا تعلق ہے، یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ جبریل امین پر کلام ربانی کے وہ اسرار منکشف نہ تھے جن کا مخزن آنحضور علیہ السلام کا سینہ تھا۔ یہاں چونکہ یہ نسبت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس لیے درمیان میں کوئی اغلاق و ابہام نہ تھا۔ عرب اپنی مادری زبان عربی ہونے کے باوجود ان مفاہیم کو نہ پا سکتے تھے جو رسالت کی زبان ترجمان ان پر واضح کرتی تھی۔

قرآن حکیم کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے کلام الملوک، ملوک الکلام کا شاہکار ہے اسے بلاغت کی زبان میں سہل ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر تو آسان معلوم ہو لیکن اس کی نقل نہ کی جا سکے۔ اس لیے اگر قرآن حکیم کو صرف نصیحت پذیری کے لیے پڑھا جائے تو وہ نہایت آسان ہے لیکن دوسری طرف اگر نکتہ آفرینی، اصول فہمی اور استنباط مسائل کے لیے پڑھا جائے، وہ نہایت دقیق و عمیق ہے۔

قرآن فہمی درحقیقت دین اسلام کی خشت اول ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے ایک بار فرمایا:

من یرداللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین

اسی طرح آپ نے اپنے عم زاد حضرت عبداللہؓ بن عباس کے قرآنی ذوق و شوق کو دیکھ کر ارشاد فرمایا تھا:

اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل(۱)

اور یہ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کو بیشتر صحابہ میں تفسیر قرآن کے حوالہ سے خصوصی برتری حاصل تھی۔

طویل عرصہ سے بعض کوتاہ نظر مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم نہ صرف نصیحت پذیری کے لیے، بلکہ نکتہ آفرینی اور استنباط مسائل کے لیے

بھی نہایت آسان ہے اور دنیا کی عام کتابوں کی طرح انتہائی سادہ ہے، نتیجہ یہ ہے کہ محض تراجم پڑھ کر قرآن حکیم کا مفہوم سمجھنے والا بکمال جرأت داد تحقیق دینے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ اور اوراق کی سیاہی میں اپنے دل کی سیاہی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس لیے یہ ضروری تھا کہ فہم قرآن کا فریم ورک تیار کیا جائے تاکہ ہر شخص قرآن مجید کو بازیچہ اطفال نہ بنا سکے۔

قارئین کی سہولت کے پیش نظر صرف پندرہ حضرات جنہوں نے قرآن فہمی کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے گرانقدر خیالات سے امت مسلمہ کو مستفید کیا، زیر نظر مقالہ میں ان کے کام کا ایک سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی (۱۷۰۲ء۔۱۷۶۲ء)

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عربی زبان میں علوم القرآن کے نام سے بکثرت کتابیں ملتی ہیں لیکن اصول تفسیر یا قرآن فہمی سے متعلق زیادہ مواد نہیں ملتا۔ عربی زبان میں علامہ ابن تیمیہ کے مختصر رسالہ کے علاوہ کوئی قابل ذکر کام موجود نہیں۔

برصغیر میں قرآن فہمی کا سہرا مجدد وقت حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے سر ہے۔ علم تفسیر و حدیث کے حوالہ سے آپ پہلے فرد ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ان علوم کو رواج دیا۔ آپ نے طویل عرصہ کے بعد باقاعدہ ترجمۃ القرآن فارسی زبان میں پیش کیا۔ اس کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے کچھ اصول بھی درج کیے۔

آپ نے اس سلسلہ میں ایک باقاعدہ تصنیف یادگار چھوڑی جو اس وقت سے آج تک مدارس عربیہ اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر شاہ صاحب نے فارسی زبان میں لکھی، اسے عربی زبان میں منتقل کرنے کا شرف جامعہ ازہر مصر کے ایک عالم محمد منیر الدمشقی کو حاصل ہے۔ اردو زبان میں بھی اس کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے الفوز الکبیر کا ایک تتمہ بھی لکھا جسے فتح الخبیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

برصغیر میں جتنے علماء گذرے ہیں شاہ صاحب کو اگر ان کا امام نہیں تو صف اوّل میں ضرور تسلیم کیا جاتا ہے، آپ نے علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر اپنی عالی دماغی سے تصرف نہ کیا ہو۔ سب سے قابل ذکر امر یہ ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالا، اسے بھرپور اور مکمل انداز میں پیش کر کے اہل علم کو حیرت میں ڈال دیا۔ آپ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ آپ نے قرآن مجید کی فہم و تبلیغ کی جو راہیں روشن کیں، انہی کی روشنی سے بعد کے علماء نے استفادہ کیا اور کرتے رہیں گے۔

شاہ صاحب کو قرآن فہمی کا یہ ورثہ اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ سے ملا تھا۔ چنانچہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں:

> "آپ کی عادت تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقہ میں روزانہ قرآن مجید کے دو یا تین رکوع پڑھتے اور پھر ان پر انتہائی تدبر اور غور و فکر کرتے"

دوسری جگہ جزء لطیف میں فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے مجھ حقیر پر بڑے بڑے الطاف فرمائے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے چند بار والد بزرگوار سے معانی قرآن میں تدبر کرنے اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن پڑھنے کا موقعہ ملا جس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا دروازہ کھل گیا"

خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں شاہ صاحب ہی نے قرآن فہمی کی راہیں استوار کیں اور یہ حقیقت ہے کہ دور جدید میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے قرآن حکیم کی طرف پلٹو(Back to the Qur'an) کی جو تحریکیں اب اٹھ رہی ہیں اس اصل کو متعین اور واضح کرنے میں جن بزرگوں نے قائد و رہبر کا کام کیا ہے ان میں شاہ ولی اللہ سرفہرست نظر آتے ہیں۔

چنانچہ دور حاضر کے مشہور عالم و مفکر سیّد ابوالحسن علی ندوی شاہ صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "دعوت الی القرآن اور خواص و اہل علم کے حلقہ میں تدبر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے امت کی اصلاح کا جذبہ بیدار کرنے کے

سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک تجدیدی و انقلابی خدمت اور کارنامہ ان کی تصنیف " الفوز الکبیر" ہے جو اپنے موضوع پر (ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانہ میں) منفرد کتاب ہے" (۲)

یہ حقیقت ہے کہ اصول تفسیر میں برصغیر میں کوئی مفصل کتاب نہیں ملتی۔ عام طور پر مفسرین اپنی تفاسیر کے مقدمہ میں اس بارے میں چند صفحات لکھ دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی الفوز الکبیر اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات علمیہ سے بھرپور ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں بالکل صحیح فرمایا ہے۔

" عنایت خداوندی سے امید ہے کہ طالب علموں کے لیے ان قواعد کے فہم کے بعد، فہم مطالب قرآن کی ایسی کشادہ راہ مل جائے گی کہ اگر مطالعہ تفسیر و مفسرین سے رجوع کرنے میں ایک عمر بھی گذاریں گے تب بھی فہم قرآن سے ایسا ربط و ضبط نہ پیدا کر سکیں گے" (۳)

اس رسالہ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ قرآنی علوم کو پانچ بڑے بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا۔ آپ سے پہلے اس قسم کی تقسیم کسی مفسر کے ہاں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ شان نزول کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو خرابیاں عہد رسالت میں موجود تھیں، وہ سب آج کے معاشرہ میں بھی موجود ہیں، لہذا قرآن پاک کا پس منظر یا شان نزول یہی ہے کہ اس کا نزول ہر دور کے حوالہ سے ہے اور یہی نکتہ اس کی عالمگیریت کی دلیل ہے۔ نیز شاہ صاحب نے نسخ کے بارے میں منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو(۵۰۰) سے گھٹا کر پانچ تک محدود کی۔

اس رسالہ کو پڑھ کر ادیان سابقہ فرق ضالہ اور اقوام و ملل کی پرانی بیماریوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کی توفیق ملتی ہے کہ قرآن کے آئینہ میں مسلمانوں کی نسلیں اور اپنے اپنے عہد کا مسلم معاشرہ اور طبقات امت اپنا چہرہ دیکھیں اور اس کی فکر کریں کہ مذاہب و فرق کی سابقہ بیماریاں اور کمزوریاں دبے پاؤں ان میں داخل تو نہیں ہو گئیں۔ (۴)

تحقیق کے مطابق برصغیر کا پہلا فارسی ترجمہ باب الاسلام سندھ میں ہوا جو مخدوم لطف اللہ بن مخدوم نعمت اللہ المعروف مخدوم نوح (م۹۹۸ھ۔۱۵۸۹ء) ساکن ہالہ (حیدرآباد) نے کیا لیکن یہ ترجمہ طویل عرصہ تک پردہ اخفا میں رہا۔[۵] شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ اس وقت سے اب تک شائقین کے پاس موجود ہے لوگ برابر اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے قرآن کا ترجمہ اس وقت کی مروج زبان فارسی میں کیا اور بعد میں ان کے دو صاحبزادگان نے اسے اردو میں منتقل کر دیا۔

قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی (۱۷۲۷ء۔۱۸۱۰ء)

شاہ ولی اللہؒ کے بعد اکثر تفاسیر عربی، فارسی، اور اردو میں لکھی گئیں، ان کے آغاز میں قرآن فہمی کے حوالہ سے کوئی مرتب اصول نہیں ملتے اور نہ ہی انہوں نے شاہ صاحبؒ کے بیان کردہ اصولوں کی طرف کوئی اشارہ کیا۔

البتہ شاہ صاحب کے ایک قابل ذکر شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی جن کی تفسیر مظہری عربی زبان میں مجموعہ علوم و فنون ہے۔ اس تفسیر کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاد حضرت محمد انور شاہؒ کشمیری نے کہا تھا:

"شاید ایسی تفسیر بسیط ارض (روئے زمین) میں نہ ہو"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا ان کو یہ بھی دقت فرمانا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے بعد ان کی تفسیر کا رتبہ بیان کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

قاضی صاحب کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ مدرسہ رحیمیہ کے فیض یافتہ تھے۔ قاضی صاحب، شاہ صاحب اور ان کی تصانیف سے بے حد متاثر تھے۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں طویل عرصہ تک شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر استفادہ کا موقعہ ملا تھا۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی تفسیر مظہری میں شاہ ولی اللہؒ کا بکثرت حوالہ دیا ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن عارف کی رائے یہ ہے کہ قاضی موصوف نے دور طالب علمی میں الفوز الکبیر کا مطالعہ کیا ہوگا فراغت علمی کے بعد لازماً یہ کتاب ان کے زیر مطالعہ رہی ہوگی۔ ان کے خیال میں اگر یہ کہا جائے تو عین مناسب ہوگا کہ الفوز الکبیر میں پیش کیے گئے اصولوں کے مطابق علم تفسیر پر پہلی کتاب " تفسیر مظہری" لکھی گئی۔ کیونکہ اس تفسیر میں الفوز الکبیر کے اصولوں کا بڑا التزام کیا گیا ہے۔(۶)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۸۷۲ء ۔ ۱۹۴۴ء)

آپ سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ تحفۃ الہند کے مصنف عبیداللہ پنڈت کی کتاب پڑھ کر اسلام کی طرف مائل ہوئے اور انہی کے نام پر اپنا نیا نام عبیداللہ رکھا۔ طالب علمی کا آغاز بہاول پور اور سندھ کے مدارس سے کیا۔ البتہ علمی و فنی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے کی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی انقلابی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ تفسیر میں آپ کی دو مستقل تصانیف ہیں۔ اردو زبان میں " القام المحمود"(۷) کا پہلا حصہ (فاتحہ، بقرہ) اور آخری پارہ عم بھی شائع ہو چکا ہے۔ عربی زبان میں" الہام الرحمٰن"(۸) کا کچھ حصہ شائع ہوا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کا خلاصہ "خلاصۃ القرآن"(۹) کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولانا سندھی کو بیشتر علوم خصوصاً تفسیر میں ایک مقام حاصل تھا۔ تفسیر میں وہ ایک مستقل مکتب فکر کے بانی تھے۔ بعض مفکرین کی نظر میں آپ شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف میں، برصغیر پاک و ہند کے بلند پایہ محقق و عظیم شارح تھے۔ چونکہ مولانا سندھی نے اسلامی تعلیمات اور قرآنی علوم و معارف کی تشریح عام مروجہ طریقہ سے ہٹ کر کی اس لیے بعض علمی حلقوں کی جانب سے ان پر کڑی تنقید کی گئی۔ مولانا سندھی کے ایک خوشہ چین مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے آپ کی تحریروں کے بارے میں لکھا:

> " مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ اتنے بڑے انشا پرداز۔ بات بہت گہری اور پتے کی کہتے تھے۔ مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اچھے اہل علم اور مفکرین بھی ان

سے بد ظن ہو جاتے تھے" (۱۰)

دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت ہو جاتا تھا۔

مولانا سندھی نے قرآن فہمی یا اصول تفسیر کے نام سے کوئی مستقل رسالہ نہیں لکھا۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ جو شخص ان کی تفسیر ایڈٹ کرے گا وہ اس کے آغاز میں ان اصولوں کی نشاندہی کر دے گا۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر منیر احمد مغل جنہوں نے " المقام المحمود" کا ایک بڑا حصہ (فاتحہ، بقرہ) ایڈٹ کر کے شائع کیا، اس کے مقدمہ میں کسی اصول تفسیر کی نشاندہی نہیں کی۔ البتہ ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ نے مولانا سندھی کی اردو تفسیر کے آخری پارہ کو شائع کرتے وقت اس کے مقدمہ میں لکھا:

> " ہر مفکر و مفسر کا کوئی نہ کوئی علمی و ذہنی موقف ہوتا ہے، اس تفسیر میں مولانا سندھی کا علمی اور فلسفی موقف شاہ ولی اللہ کی حکمت اور فلسفہ و تعلیم ہے اس وجہ سے شاہ ولی اللہ کی حکمت کی بکثرت اصطلاحات اور الفاظ مستعمل ہیں" (۱۱)

مولانا سندھی کے نظریہ فہم القرآن سمجھنے کے لیے ان کے کئی مقالات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خصوصاً درج ذیل :

۱۔ قرآن کا انٹرنیشنل انقلاب

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ

مولانا سندھی نے ایک خطبہ جو آپ نے ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی میں پڑھا تھا اس میں قرآن فہمی کے اصول پیش کرنے کی بجائے علماء و مفسرین پر واضح تنقید کی۔

آپ کے خیال میں صحابہ کرام کے بعد خود علماء ہی اپنی تفسیروں کے حوالہ سے حجاب بنتے چلے گئے جو شخص جس فن میں ماہر تھا اس نے اس کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور قرآن مجید کے مطالب کو اس فن میں محصور کرنے کی کوشش کی۔ (۱۲)

قرآن مجید سے مسلمانوں کے تعلق کے حوالہ سے آپ کا یہ کہنا درست ہے :

" یا تو ہم اس ذریعہ شفاء کو استعمال نہیں کرتے ، یا اگر کرتے ہیں تو غلط اور غیر مناسب طریقہ سے استعمال کرتے ہیں"(۱۳)

آپ کے خیال میں قرآن حکیم کی تعلیم اور تفسیر قرآن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ ہیں ایک چیز نہیں۔ اپنے موقف کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

" اصل قرآن چھوڑنے سے اور اس کے صحیح طریقہ سے مستفید نہ ہونے سے ایک تو قرآن کے الفاظ کے غلط مفہوم رائج ہو گئے ہیں اور دوسرا اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس کی تعلیم کا ایک حصہ ہم نے بھلا دیا ہے" (۱۴)

چونکہ مولانا سندھی کے تمام افکار و نظریات کی بنیاد فلسفہ شاہ ولی اللہ ہے اس لیے قرآن فہمی کے حوالہ سے آپ کے تمام افکار کی بنیاد اور اس کا ماخذ فلسفہ شاہ ولی اللہ ہے۔ آپ نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ قومی زندگی میں فرد کی بجائے اجتماع کو اہم مانتے ہیں۔ آپ کے بقول خود شاہ صاحب انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے تھے۔

مولانا سندھی نے تین نکات کو اپنے فکر کی اساس قرار دیا ہے :

۱۔ دیوبند کی تعلیم

۲۔ یورپ کی سیاست کا مطالعہ

۳۔ شاہ ولی اللہ کی فکر

ان تینوں چیزوں نے انہیں تاریخ کے واقعات و حوادث کو اجتماعی نکتہ نظر سے دیکھنے کا عادی بنا دیا۔(۱۵)

چنانچہ مولانا سندھی کے بقول اس فیصلہ کا میرے افکار پر پہلا اثر یہ ہوا کہ مجھے قرآن مجید کی اپنی تفسیر پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ اس موقعہ پر آپ نے ایک تاریخی فیصلہ درج کیا۔

"اس فیصلہ کے بعد میں نے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لیے ضروری قرار دیا اور مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور میں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا کہ قرآن مجید کو اس طرح سمجھے بغیر اسے دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کرنا کسی طرح ممکن نہیں"(۱۶)

اپنے دور کے علماء کی قرآن فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"قرآن عظیم کو عملاً آیات احکام تک محدود کر دینے، نیز اس کی آیات کو عمومی مطالب کی بجائے جزئی واقعات سے مختص کرنے کا اثر یہ ہوا کہ قرآن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی میں موثر نہ رہا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ ہماری تمام عملی سرگرمیوں میں مشعل ہدایت بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ محض پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ گیا"(۱۷)

فقہی تفاسیر کے حوالہ سے آپ کی رائے یہ ہے:

"جن لوگوں کے نزدیک فقیہ بننے کے لیے فقط اوامر و نواہی کا جان لینا کافی ہے ہماری رائے یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے مقاصد سے بالکل نابلد ہیں"(۱۸)

مولانا سندھی نے مشہور تفاسیر کے مطالعہ کے بعد اپنا تجربہ اس طرح بیان کیا:

"ہم نے فخر الدینؒ رازی، جار اللہ زمخشریؒ کی تفاسیر کا مطالعہ کیا، اسی طرح ابن کثیر اور معالم التنزیل ان سب تفسیروں کے ذریعہ ہم نے قرآن سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی لیکن سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہ ہوا"(۱۹)

مولانا سندھیؒ کے پیش کردہ ان تفسیری نکات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا سندھی قرآن فہمی کے حوالہ سے سابقہ تفسیری لٹریچر سے غیر مطمئن ہیں۔ مولانا اپنے مخصوص سیاسی و تحریکی مزاج کی بدولت قرآن مجید کو بطور زندہ کتاب اور اس کی تفسیر و تاویل بھی اسی انداز سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں قرون اولیٰ کے مسلمان اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کو ایک عالمگیر قوت بنا کر دنیا کے ہر حصہ میں اس کی

عظمت و رفعت کا علم سربلند کرنے لگے۔ آخر اس صدی میں وہ زوال کی کیفیت سے کیوں دو چار ہیں؟

مولانا ابوالکلام احمد آزادؒ (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء)

مولانا آزاد نے ایک نہایت راسخ العقیدہ خاندان میں آنکھ کھولی۔ اپنے زمانہ کے علوم متداولہ بہت جلد مکمل کر لیے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت بہت جلد ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ مولانا آزاد کی شہرت بطور خطیب، سیاستدان اور صحافی کے ہے۔ آپ کی عبقریت و ذہانت کی وجہ سے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ قرآن مجید کے حوالہ سے کوئی معیاری کام منظر عام پر لائیں گے۔ بعد میں وہ بڑی حد تک اس ترجمانی میں کامیاب رہے۔

ممکن ہے مولانا نے اپنی تصنیفی زندگی میں قرآن فہمی پر بطور خاص کچھ لکھا ہو اور ہم تک نہ پہنچ سکا ہو۔ ترجمان القرآن کے آغاز میں آپ نے فہم القرآن کے حوالہ سے بہت مختصر نکات درج کیے ہیں۔

مولانا نے دور غلامی کے تفسیری سرمایہ پر دل کھول کر تنقید کی۔ الہلال میں ایک قرآنی شائق کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے لکھا:

> " قرآن کے مطالعہ تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ اس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہ ہو جائیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ صدر اول کے بعد سے قرآن کریم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہو گئیں۔ ایک قرآنی، دوسری غیر قرآنی۔۔۔ غیر قرآنی سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے۔ یہ علوم وضعیہ کی اشاعت، ایرانی، رومی اور ہندی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقوام کے اختلاط کا قدرتی نتیجہ تھا۔

مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن حکیم کے مطالب اس شکل و نوعیت میں دیکھے جیسی شکل و نوعیت کی فکری حالت ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی

کہ قرآن کے الفاظ، تراکیب، اسلوب بیان، دلائل و براہین، مواعظ و حکم سب نے ایک دوسری ہی طرح کی نوعیت اختیار کر لی۔ قرآن کی تعلیم و بیان کی تمام تر بنیاد فطرت اور فطرت کی سادگی پر تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہماک بڑھتا گیا فطرت کے ذوق و فہم کی استعداد کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب لوگوں کے دماغ اس درجہ وضعیت اور وضعی طریق بحث کے عادی ہوگئے کہ کسی اہم اور عظیم بات کو اس کی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

مقدمات کے طریقہ کا تمام تر دارومدار وضعی علوم کے فطری مسلمات پر ہوتا ہے اور یہ مسلمات نہ تو ہر حال میں حقیقی ہیں اور نہ ہر زمانہ کی علمی استعداد یکساں طور پر ان کا اعتراف کر سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کل تک جو بات مسلمہ طور پر مانی جاتی تھی آج اتنی کمزور ہو جائے کہ لوگ اس کی ہنسی اڑائیں۔ ایمان کی بنیاد ایسی متغیر اور متلون بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔(۲۰)

مولانا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ جدید ذہن اور اس کے تقاضوں سے آشنا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان روایتی نظریات کو تسلیم کرنے سے باغی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

> " افسوس قرآن کہاں لے جانا چاہتا تھا اور دنیا نے اسے اپنے سر پر رکھ کر کدھر کا رخ کیا۔ ہمارے مفسرین، متکلمین ارسطو کی منطق اور یونانیوں کی دانش فروشیوں میں ایسے گم ہوگئے کہ انہیں دوسری راہوں کی خبر ہی نہ رہی"(۲۱)

جہاں تک خود مولانا آزاد کا قرآن سے تعلق و شغف ہے وہ آپ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلسل ۲۷ برس تک قرآن اور اس سے متعلقہ علوم کا مطالعہ کرتے رہے۔

مولانا آزاد کے قرآن فہمی کے بنیادی تصورات کی جھلک

آپ کے خیال میں ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی تمام تفصیلات انہی کے گرد گردش کرتی ہے جب تک وہ مراکز سمجھ میں نہ آئیں کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

اس بناء پر ان کے نزدیک فہم قرآن کی صحت کے لیے عربی لغت و ادب کا صحیح ذوق شرط اوّل ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ روبانحطاط ہوتا چلا گیا اور بعد میں طرح طرح کے الجھاؤ کا خالق بن گیا۔ آپ کے خیال میں اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا۔ یعنی مطالب قرآن سمجھنے میں لوگوں سے لغزشیں ہوئیں۔ ایسی تفسیر سے مقصود وہ تفسیر نہ تھی جو اس لیے نہ کی جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی دلیل کیا چاہتی ہے۔(۲۲)

خود مولانا کا اس میدان میں قدم رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن مجید کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

مولانا اس ضمن میں اس لیے بھی کامیاب ہوئے کہ وہ ایک طرف اسلام کی قدیم راہوں سے آشنا تھے تو دوسری طرف نئے علوم اور نئے تقاضوں پر بھی ان کی گرفت تھی۔ وہ صدیوں کے بتوں کو توڑنے والے بت شکن کی جرات بھی رکھتے تھے۔

آپ نے اپنی مجتہدانہ اور محیر العقول ذہانت کے ذریعہ اسلام کے بنیادی مسائل جن پر صدیوں کی تعصب اور تنگ نظری کی گرد جمی ہوئی تھی اس طرح اجاگر کیا کہ اسلامی تاریخ میں اسلام کی عظمت اور اس کی اہمیت مسلم ہوگئی۔

۲۔ مولانا کا فہم قرآن کے حوالہ سے دوسرا اصول تعقل و تدبر کی دعوت ہے۔(۲۳) کہ انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر باہر جو کچھ بھی محسوس کرے اس میں تفکر و تدبر کرے۔ ان

کے نزدیک قرآن مجید کا استدلال یہ ہے کہ اس کے نزول کے وقت دینداری اور خداپرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھہر گئی۔ قرآن مجید براہ راست تلقین کا قدرتی طریقہ اور سیدھا سادا انداز اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں الجھی ہوئی نہیں۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا یہی اسلوب تخاطب جو تعقل اور وجدان کی حسین آمیزش ہے قارئین کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

پھر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہ ابوالکلام جو الہلال اور تذکرہ کے صفحات پر گھن گرج کے ساتھ طلوع ہوا تھا اور جس نے قارئین کے دل و دماغ کو اپنی زلف گیرہ گیر کا اسیر بنایا، ترجمان القرآن میں وہی قلم سادہ اور پرکار ہو جاتا ہے۔(۲۴)

۳۔ مولانا نے اپنی ذہنی اور فکری زندگی کے آغاز میں اپنا نصب العین یہ بنایا تھا کہ وہ اسلام کو اس کی اصل اور بنیادی شکل میں پیش کریں گے۔ ادیان عالم کے مطالعہ سے ان پر اسلام کی اہمیت منکشف ہو چکی تھی۔ کفر والحاد کی وادیاں چھاننے کے بعد وہ از سر نو ایمان لائے تھے۔ اجارہ داران تسبیح و مصلی کا طنطنہ، مغرب پرستوں اور تجدد پسندوں کا ہمہمہ، مدعیان حضارت و ثقافت کا فلسفہ جس نو تصنیف اسلام کا سکہ چلا رہا تھا، مولانا کی سادہ طبیعت اس پر قناعت نہ کر سکی، اور وہ روز اوّل سے یہ طے کر چکے تھے کہ شک کو جستجو کی علت بنا کر اپنی بیمار لوح و قلم سے علم و فکر کی راہوں میں بچھے ہوئے تقلید و روایت کے کانٹے ہٹا دیں گے۔

مولانا نے اپنی اس نئی کوشش کے بارے میں لکھا:

> "میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ میں خود نہیں کر سکتا البتہ یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ قرآن کے مطالعہ تدبر کی ایک نئی راہ کھل گئی ہے۔ اہل نظر اس راہ کو ان تمام راہوں سے مختلف پائیں گے جس میں آج تک خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں"(۲۵)

عبدالماجدؒ دریابادی (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی اصل وجہ شہرت بطور ایک ادیب و صحافی ہے۔ آپ نے قرآنی علوم و معارف کے حوالہ سے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ خصوصاً انگریزی زبان میں ترجمہ قرآن اور بعد میں اردو زبان میں تفسیر ماجدی کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو زیادہ تر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ تفسیر لکھتے وقت ان کے پیش نظر پندرہ عربی تفاسیر اور عربی لغت کی کئی کتابیں موجود تھیں۔

قرآن حکیم کے حوالہ سے آپ کی آٹھ کتابیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے خیال میں آپ کی دونوں تفسیریں (انگریزی، اردو) ماجد کی دقت نظر، وسعت مطالعہ، قرآن فہمی، تدبر فی الآیات، تمسک بالسنۃ اور اجتہادی نظر کا ایک جیتا جاگتا کارنامہ ہیں۔(۲۶)

مولانا عبدالماجد نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں قرآن فہمی کے حوالہ سے چند مفید نکات درج کیے ہیں جو پانچ سے زائد نہیں:

۱۔ قرآن مجید ایک نہایت درجہ مرتب و منظم کتاب ہے۔ اس لیے اس نسبت سے دشوار بھی ہے اسے جو آسان کہا گیا ہے وہ صرف موعظت و عبرت پذیری کے اعتبار سے ہے۔ مدتوں کے مسلسل اور غائر مطالعہ کے بعد کہیں اس سے مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن فہمی میں بہت زیادہ عجلت کو دخل دینا ہرگز مناسب نہیں۔(۲۷) ایسا ریمارکس وہی شخص دے سکتا ہے جو اس پرخار وادی کا مسافر رہ چکا ہو۔ اس سے ان کے تعمق فکر کی عکاسی ہو رہی ہے۔

۲۔ قرآن کریم ایک زندہ صحیفہ بھی ہے اور ماضی کی کتاب بھی۔ ایک طرف اس کی مخاطب عرب کی وہ قوم تھی جو اس کے نزول کے وقت موجود تھی، دوسری طرف اس کے مخاطب روس، جاپان، ہندوستان، امریکہ کل روئے زمین کے باشندے۔ اس کی یہ دونوں حیثیتیں نہ صرف موجود ہیں بلکہ برابر ساتھ چلتی ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے نہایت حکیمانہ اسلوب اختیار کی کہ صراحتیں تو تمام تر مذاق عرب کے مطابق ہیں لیکن ساتھ ہی اشارے ایسے بھی رکھے کہ بعد کی نسلیں اور ہر دور کے مخاطب اپنی اپنی فہم

و استعداد کے ماتحت اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔(۲۸) مولانا دریا بادی کا یہ لطیف نکتہ کسی مفسر و محقق کے ہاں نہیں ملتا اس میں قدامت و جدت کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔

۳۔ ایک عمومی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھا: کہ جہاں تک قرآن کے طرز ادا اور اسلوب خطاب کا تعلق ہے وہ عربی کلام ہے اس روانی، شستگی، سلاست اردو، فارسی، ہندی، انگریزی، ترکی یا جرمنی ادب کے معیار سے تلاش کرنا کوتاہ فہمی ہے، اس کی انشا پردازی اور بلاغت کو جب کبھی کسی غیر معمولی معیار سے دیکھا جائے گا تو ہمیشہ غلطی فہمی ہی ہوگی۔(۲۹)

۴۔ طہارت قلب و طہارت جسم کا مطلق اہتمام کیے بغیر محض زبان دانی کے بھروسہ پر قرآن سمجھ لینے کی کوشش ایک سعی لا حاصل ہے۔ ابوجہل، ابولہب سے بڑھ کر زبان دان اور کون تھا لیکن اپنی روح کو انہوں نے قرآنی روح سے یکسر بیگانہ و ناآشنا رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن ان پر ذرا بھی نہ کھلا، اور وہ فہم قرآن کے درجہ ادنیٰ کی بھی سعادت سے محروم ہی رہے۔(۳۰) مولانا کے اس نکتہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ تصوف کی ولدیوں سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ ہمارے ذاتی خیال میں محض ذہانت و فطانت اور قادر الکلامی فہم قرآن کے لیے سد راہ بنتی رہی ہے۔

۵۔ یہ نکتہ شاید ان لوگوں کے لیے ہے جو کسی رہنما کے بغیر مطالعہ قرآن اور قرآنی علوم و معارف سے براہ راست استفادہ کا دعویٰ کرتے ہیں۔

مولانا دریا بادی کے خیال میں چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں استاد کی ضرورت ناگزیر رہی ہے۔ پھر قرآن کا علم تو بڑا مہتم بالشان علم ہے۔ اس میں کوئی طالب علم استاد سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی کامل الفن نہ ملے تو اس کی قائم مقامی اکابر مفسرین و شارحین کی کتابیں کر سکتی ہیں۔(۳۱)

تفسیر ماجدی کی قرآن فہمی کا اندازہ مذکورہ پانچ اصولوں کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ پوری تفسیر کے مطالعہ سے آپ کی دقت نظر، وسعت مطالعہ اور مجتہدانہ طرز احساس کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے دلنشین اسلوب، منطقی طرز استدلال اور جوش بیان

کا بھی خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گوناگوں ادبی محاسن نے اس تفسیر کو ایک خاص امتیاز عطا کیا ہے۔(۳۲)

مشہور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے ایک تبصرہ نگار نے اس کے بارے میں لکھا تھا:

" اردو میں تفسیر ماجدی پہلی کتاب ہے جس میں علم و تحقیق اور روایت و درایت کو ہم آہنگ کیا گیا ہے، پوری تفسیر میں کہیں سلفیت سے تجاوز نہیں کیا گیا" (۳۳)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی(۱۹۸۵ء)

مولانا سعید احمد اکبر بادی۔ ایم اے دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ سید محمد انور شاہ صاحب سے دیوبند و ڈابھیل میں خصوصی استفادہ کیا۔ بعد میں فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈین اور رسالہ برہان دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ کثیر المطالعہ اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، قرآن مجید کے حوالہ سے آپ کی دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ وحی الٰہی، ۲۔ فہم القرآن

یہاں ہم مؤخر الذکر کے حوالہ سے اپنا تجزیہ پیش کریں گے۔

فہم القرآن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور نے یہ کتاب مخصوص طبقہ کے ذہنی شبہات کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی۔ خصوصاً وہ حضرات جو اپنے آپ کو جدید تعلیم یافتہ ظاہر کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ محض ترجمہ قرآن کے بل بوتے پر وہ بھی قرآنی علوم و معارف سے پوری طرح بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا گروہ وہ ہے جو قرآن فہمی کے لیے حدیث کی حجیت و اہمیت کا قائل نہیں۔

چنانچہ فہم القرآن دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں طویل تمہید کے بعد قرآن فہمی کے چار بنیادی اصول و شرائط واضح کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرائط جماعت

علماء کے لیے نہیں بلکہ اس مخصوص گروہ کے لیے ہیں جو آیت و لقد یسرنا القرآن للذکر(۵۴:۱۷) سے یہ مفہوم سمجھتا ہے، کہ ہر شخص اپنی ذہانت و فطانت کی بنیاد پر قرآنی بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔

مولانا اکبر آبادی کے خیال میں یہ دعویٰ کہ قرآن حکیم انتہائی آسان کتاب ہے۔ یہ اس مقولہ کا مصداق ہے ، کلمة حق ارید به الباطل۔ مولانا نے اس نظریہ کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ اگرچہ وہ ہندوستان فتح کر چکے، لیکن یہاں کے باسی مسلمان اب بھی قرآن فہمی کے لیے علماء وقت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طرح علماء کا وقار ختم کر دیا جائے تاکہ لوگ خود براہ راست اپنی مرضی سے قرآن کریم کی تشریح و تاویل کر سکیں۔(۳۴)

مولانا اکبر آبادی کے نزدیک قرآن مجید کے آسان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تعلیمات آسان ہیں۔ وہ فلسفہ و منطق کے مسائل کی طرح پیچیدہ و گنجلک نہیں۔ رہی صحیح قرآن فہمی اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان قرآن مجید کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے، اور یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضیٰ کیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے فہم قرآن کے چار بنیادی شرائط بیان کی ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم سمجھنے کے لیے پہلی اور ابتدائی شرط عربیت ہے۔ عربیت سے مراد اتنی استعداد نہیں کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ یہ ذوق محض مقامات حریری، دیوان متنبی و حماسہ۔ یا ایم اے عربی و اسلامیات کے کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو خود اس کو اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ اگر کسی میں یہ ذوق پیدا نہ ہو سکے تو اسے ائمہ اسلام پر اعتماد کرنا ہوگا پھر زبان و بلاغت کا ذوق ایک نعمت خداوندی ہے، اس کے استوار ہونے میں زبان کے علوم صرف و نحو اور معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔

۲۔ مولانا کے خیال میں دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لیے از بس ضروری ہے، وہ نور بصیرت ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے ذوق قرآنی کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لیے عام ذہانت و فطانت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ہو۔ پہلی شرط کسبی ہے اور دوسری وہبی۔

۳۔ تیسری شرط تقویٰ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلام الٰہی سن کر اس کا اثر قبول کر سکے۔ اس کی طرف اس قرآنی آیت میں اشارہ ملتا ہے:

سا صرف عن آیاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق(۱٤٦:۷)

اگر مریض میں دوا کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو طبیب حاذق کیا کرے گا۔

۴۔ فہم قرآن کی چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر اس کی تفسیر و تاویل کی جرأت نہ کی جائے، بلکہ قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرز ادا و طریقہ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ایک جگہ جو کسی لفظ کے معنی مراد لیے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں۔(۳۵)

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت، ادب، اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، اس کے حقیقی مراد و مصداق متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعت اسلام کے سرچشموں سے کماحقہ واقف ہو اور اس میں مبصرانہ درک رکھتا ہو۔ اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امرؤ القیس کے اشعار جاہلیت کی تاریخ، معاشرت، تہذیب و تمدن اور روایات و توہمات کو جانے بغیر سمجھنا چاہتا ہے۔

ہمارے خیال میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر انتہائی جامع ہے۔ آپ نے اس کتاب میں ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس سے تشنگی

موضوع کا احساس نہیں ہوتا۔ مزید برآں آپ کا انداز بیان اتنا مسحور کن ہے جو ہر غیر جانبدار قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ اس سلسلہ کی کامیاب کوشش ہے اور اس غلط فہمی کا عملی ازالہ کر رہی ہے کہ بعض افراد کے ہاں قرآن مجید کو دنیا کی آسان کتاب سمجھ کر اس کے آداب و ملحوظات کو پیش نظر رکھنا ضروری نہ سمجھا گیا۔

مولانا عبداللہؒ درخواستی (خان پور)(۱۸۹۷ء۔۱۹۹۴ء)

بہاول پور کے مضافات میں خان پور کا علاقہ بہت مشہور ہے۔ یہاں کی سرزمین سے ایک شخصیت عبداللہ درخواستی نے جنم لیا۔ آپ اہل علم کے ہاں حافظ الحدیث کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ مدتوں اپنی درسگاہ مخزن العلوم خان پور میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ شعبان و رمضان المبارک کے مہینوں میں عربی و دینی مدارس میں دورہ تفسیر پڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر قرآنی علوم کے بارے میں عموماً اور سورۃ فاتحہ سے متعلق جو معارف علمیہ ان کی زبانی بیان ہوئے، انہیں محمد عبیداللہ درخواستی نے قلم و قرطاس کے توسط سے محفوظ کیا۔ یہ رسالہ آج سے ۶۵ برس پیشتر "مقدمۃ الفرقان مع توضیح ام القرآن" کے نام سے شائع ہوا تھا[۳۶] یہ رسالہ ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے آغاز میں قرآن حکیم کا موضوع، تعریف اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ پھر علم تفسیر کی تعریف غرض و غایت اور اس کے اقسام درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تفسیر و تاویل کا فرق، فضائل قرآن، قرآن کے سلاسل، حروف مقطعات کی وضاحت اور قرآن مجید کا خلاصہ وغیرہ۔

اس رسالہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر شاہ ولی اللہؒ کے بیان کردہ علوم خمسہ کی روشنی میں کی گئی ہے جس سے اس رسالہ کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

اس رسالہ کے بالاستیعاب مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا درخواستی نے یہ علوم و طریق تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی سے اخذ کیے تھے۔ چونکہ مولانا سندھی کا

سر زمین بہاول پور سے قدیم تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز یہیں سے کیا۔ اور اپنی اکلوتی بیٹی یہاں بیاہی اور زندگی کے آخری لمحات یہاں گذارے اور آپ کا مدفن دین پور(خان پور) میں ہے۔ مولانا درخواستی نے ان کے قیام بہاولپور میں کسب فیض کیا ہوگا۔ کیوں کہ وہ تفسیر سورۃ فاتحہ میں مولانا سندھی کا بار بار حوالہ دیتے ہیں۔

علم الاحکام کے ضمن میں مولانا سندھی کا یہ ریمارکس نقل کرتے ہوئے لکھا:

" جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے ہمارے فقہاء نے "اصول فقہ" میں بے شک قرآن عظیم کو پہلے رکھا تھا لیکن عملاً وہ قرآنی مطالب کی بحث و تمحیص میں آیات احکام سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ ان کی ساری کوشش اس امر تک محدود رہتی تھی کہ قرآن کے اوامر و نواہی پر بحث کریں۔ قرآن حکیم کو محض ان محدود معنوں میں قابل عمل سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام علماء نے تمام قرآن کو سمجھنا ضروری نہ سمجھا اور آخر کار قرآن کی تفسیر واعظوں، قصہ گو اور افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور فقہاء کا اس میں دخل نہ رہا"(۳۷)

خلاصہ یہ کہ اس رسالہ میں علوم خمسہ کا سورۃ فاتحہ پر انطباق کر کے دکھایا گیا ہے۔یہ مضمون عام تفاسیر قرآن میں نہیں ملتا۔ سورۃ فاتحہ کے حوالہ سے ایسی توضیحات خود مولانا سندھی کی اردو تفسیر "القام المحمود" میں نہیں ملتی۔

مولانا محمد حنیفؒ ندوی (لاہور)

مولانا محمد حنیفؒ ندوی پاکستان کے جلیل القدر اور ممتاز محقق تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس و خطابت سے کیا۔ برسوں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ رہے۔ تقریباً ۱۴ کتابوں کے مصنف تھے۔ قرآن مجید کے حوالہ سے آپ کی تین کتابیں ملتی ہیں:

۱۔ تفسیر سراج البیان (پانچ جلد)

۲۔ لسان القرآن (دو جلد)

۳۔ مطالعہ قرآن

ہم یہاں صرف مؤخر الذکر پر کلام کریں گے۔ یہ کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جو قرآن مجید کے حوالہ سے مختلف معلومات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں فہم القرآن کے حوالہ سے کوئی اصول پیش نہیں کیے البتہ مختلف علماء و مفسرین کی کتابوں کی روشنی میں قرآن مجید اور تفسیر کے بارے میں مختلف معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ تفسیر کے باب میں آپ نے زیادہ تر مفسرین صحابہ کے حوالہ سے گفتگو کی جو اس فن میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح آپ نے تفسیر کے دو مشہور مکاتب فکر اصحاب الحدیث و اصحاب الرائے کا تعارف کرایا ہے اور ان دونوں طبقوں کے نمائندہ مفسرین کے نام گنائے ہیں۔ اہل الحدیث کی جانب سے علامہ طبری اور اہل الرائے کی نمایندگی امام رازی کے حوالہ سے کی ہے۔

اس کتاب میں دور حاضر کے حوالہ سے خصوصاً اردو زبان میں تفسیری سرمایہ کے سلسلہ میں کوئی باب موجود نہیں۔ آپ خود مفسر قرآن تھے۔ اس لیے دور حاضر کی تفاسیر پر بآسانی محاکمہ کر سکتے تھے۔

اس کتاب کے وہ ابواب زیادہ قیمتی و معلوماتی ہیں جہاں آپ نے کتب سابقہ خصوصاً بائبل کے عہد نامہ قدیم و جدید کے مضامین کا قرآنی مضامین سے تقابلی مطالعہ کیا ہے۔[۳۸] یہ نگارشات اچھوتی ہیں۔ اس موضوع پر عام مصنفین نے کم قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کے اکثر ابواب کی تدوین میں مصنف نے علماء سلف و حال دونوں کی کاوشوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر برہانؒ احمد فاروقی (لاہور) (۱۹۰۵ء۔۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی اعلیٰ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ماحول میں ہوئی۔ آپ نے اپنے تعلیمی مراحل ڈاکٹر ظفر الحسن کی زیر نگرانی طے کیے۔ آپ دور حاضر کے شاید واحد مسلمان فلسفی ہیں جنہیں قرآن کریم اور ان کی تعلیمات پر غیر متزلزل یقین تھا۔

آپ کا فن اختصاصی فلسفہ تھا لیکن قرآنی علوم و معارف پر گہری نظر تھی۔ آپ نے قرآنی علوم و معارف کے حوالہ سے دو تصانیف چھوڑی ہیں۔

۱۔ منہاج القرآن (پونے تین سو صفحات)

۲۔ قرآن اور مسلمانوں (سوا تین سو صفحات)
کے زندہ مسائل

اس سے قبل کہ ڈاکٹر صاحب کی قرآن فہمی کے حوالہ سے کچھ کہا جائے۔ آپ کے ایک لیکچر کا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں قرآن فہمی کے حوالہ سے علماء امت سے کیا توقعات وابستہ تھیں اور ان مسائل کا حل، وہ انہی سے چاہتے تھے۔ آپ نے کہا:

> " مطالعہ قرآن سے آرزو تو غلبہ حق کی پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ غلبہ باطل کا ہوتا ہے جس کا ایک اثر یہ ہے کہ ہم نے خدا کی ایک طاقت، ایک نظام اور ایک قانون کا یقین کھو دیا ہے۔ ہم سے بعض توحید کی جائے تثلیث کے شکار ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے، ہماری سیاست جمہوریت اور ہماری معیشت سوشلزم ہے اور بعض توحید کی جائے ثنویت میں گرفتار ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے اور ہماری سیاست جمہوریت ہے اور کوئی نہیں کہتا کہ ہمارا سب کچھ اسلام ہے"

بعد میں اسی لیکچر میں علماء سے ایک سوال کیا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خوف و حزن سے محفوظ زندگی عطا کرتا ہے کیا ہمارے زندگی ہر قسم کے خوف و حزن میں مبتلا نہیں؟

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں فلسفہ کو الہامی فریم ورک کے اندر رکھنے اور مسلمانوں کو ان کے اپنے تشخص کا شعور دینے کا مشن اپنائے رکھا۔ آپ کو پختہ یقین تھا کہ مسلم امت اس وقت تک فکری غلامی سے نہیں نکل سکے گی جب تک فکر و علم کا فریم ورک تبدیل نہیں ہوتا اس کی تبدیلی کے بغیر فکری تبدیلی ممکن نہیں۔(۳۹)

درحقیقت ڈاکٹر صاحب کے قرآنی فکر کی اساس یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن پاک اپنے آپ کو " حجة من بعد الرسل" قرار دیتا ہے، ہماری دینی حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ دور جدید کی جاہلیت کے چیلنج کو قبول کر کے اس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید ہی سے رہنمائی حاصل کریں۔(۴۰)

یعنی ختم نبوت کے بعد اس امت کے مسائل کا حل قرآن مجید کے ذریعہ اس طرح ممکن ہے جس طرح آنجناب علیہ السلام نے زمانہ نزول قرآن میں اس امت کو دور جاہلیت سے نکال کر عالمی قیادت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر کے مطابق قرآنی طریق انقلاب کے نتیجہ خیز ہونے کے درج ذیل بنیادی شرائط یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں کی زندگی کے انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی پہلوؤں میں جو خرابیاں واقع ہو چکی ہیں لولاً ان کی اصلاح کی جائے، مثلاً انفرادی زندگی میں اس کے تینوں پہلوؤں (ذہنی، ایمانی، اخلاقی) کی اصلاح رضا الٰہی کے حصول کی جدوجہد کرنے سے وابستہ ہے۔

۲۔ اجتماعی زندگی میں جو تضادات ہیں ان کا تدارک ایک ایسے معاشرے کے قیام سے وابستہ ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو اور اخلاقی جدوجہد کرنے والے افراد پر مشتمل ہو۔ اور جن کی جدوجہد کا مقصد یہ ہو کہ افراد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ رہیں اور بین الاقوامی زندگی جو دشمنی اور عناد سے عبارت ہے اور ہر طرف جنگ و جدال کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ قرآن مجید اس صورت کو ختم کر کے بین الاقوامی سطح پر دین حق کو غالب کر کے پوری انسانیت کو امت و عافیت کا ماحول فراہم کرنا چاہتا ہے۔(۴۱)

۳۔ مغربی تہذیب سے متاثر اذہان اور قرآن مجید کو فرسودہ کتاب کہنے والوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا:

> " ہم بالکل معصومانہ انداز میں یہ بھولے جا رہے ہیں کہ اسلام نے دنیا کو مادی اعتبار سے کم از کم اتنی تابناک تہذیب عطا کی تھی جتنی تابناک مغربی تہذیب ہے اور انتہائی بدنصیبی سے ہم یہ حقیقت نظر انداز کیے دے رہے

ہیں کہ آج بھی اسلام اور صرف اسلام ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے صحت مند، عمرانی اعتبار سے مستحکم اور معاشی اعتبار سے عادلانہ تہذیب پیدا کر سکے اور اسے برقرار رکھ سکے"(۴۲)

۴۔ آپ نے امت مسلمہ کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کر کے اس کا حل اس طرح پیش کیا۔ اس سلسلہ میں اہم شرط یہ تھی کہ ہماری محکومی کے دور میں ہماری فکری بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اسلامی تحقیق سے ان کا کھوکھلا پن رفع کیا جاتا اور یقین کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ مگر ہم اس نوع کی جدوجہد کے بغیر ترقی کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات بھولے جاتے ہیں کہ صرف مادی تہذیب، مادی سازوسامان اور مادی جدوجہد کی اساس پر دنیا کی کوئی قوم خاص طور پر مسلمان نہ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ زندہ رہ سکتے ہیں۔(۴۳)

آپ کے خیال میں مذہبی ذہن یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ رسالت میں برپا ہونے والا انقلاب کتاب و سنت کی پیروی کی بجائے پیغمبر علیہ السلام کی معجزہ کاری تھی وہ ان شرائط کی جستجو نہیں کرتا جن کی بنیاد پر حتمی نتائج کے پیدا ہونے کی ضمانت قرآن مجید کے دور مابعد رسالت میں حجت ہونے کی بنیاد پر میسر آتی ہے۔ اس صورت حال سے نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ قرآن کریم کو صحیفہ انقلاب سمجھ کر اس سے انقلابی جدوجہد میں اس ہدایت کی تمنا کی جاتی جو قرآن مجید نے پیغمبر انقلاب کو فراہم کی تھی۔(۴۴)

ہمارے خیال میں ڈاکٹر فاروقی کے نزدیک قرآن مجید ایک فلسفہ کی کتاب ہے جس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، وہ اپنے مخصوص فلسفیانہ نکتہ نگاہ سے امت مسلمہ کی اصلاح چاہتے ہیں۔

غلام احمد پرویز(لاہور) (۱۹۰۳ء۔۱۹۸۵)

پرویز صاحب کا گھریلو ماحول سخت مذہبی اور روایتی تھا۔ لیکن آخر کار ان کی آزاد فطرت نے ان نظریات و اثرات قبول کرنے سے اِبا کیا۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے کیا۔ مسلسل تیس برس تک اس سے وابستہ رہے۔ آپ نے قرآن حکیم کے حوالہ سے چار ضخیم کتابیں پیش کیں:

۱۔ لغات القرآن (چار جلد)

۲۔ تبویب القرآن

۳۔ مفہوم القرآن

۴۔ معارف القرآن

اس کے علاوہ مسلسل ۲۵ برس تک گلبرگ لاہور میں ہفتہ وار درس قرآن بھی دیتے رہے۔ فہم القرآن کے حوالہ سے آپ کا کوئی مستقل مقالہ یا کتاب تو نہیں ملتی البتہ ان کی مختلف تصانیف میں اس طرف کچھ اشارات ملتے ہیں۔ ان کے بقول مسلسل مطالعہ اور فیضان اقبال سے تین بنیادی نکات سمجھ میں آئے:

۱۔ قرآن کریم اپنے آپ کو نور کہتا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی خارجی ذریعہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خود دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام اشیاء کی اصل حقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے۔(۴۵)شعلہ مستور میں اس امر کو اس طرح پیش کیا:

> " قرآن مجید کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی سمجھ میں نہ آئیں، تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہ کیجئے۔ بلکہ قرآنی حقائق اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجئے تا آنکہ مزید تحقیق و تدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔ ہمارے تمام رجحانات و معتقدات قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس"(۴۶)

پرویز صاحب کے اس اقتباس سے تضاد افکار کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی تضاد ان کی تمام کتابوں میں نظر آتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم عربی زبان میں نازل شدہ کتاب ہے اس لیے اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے محاورہ عرب کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔(۴۷)

اپنی دوسری تصنیف مفہوم القرآن میں اس حقیقت کو اس طرح واضح کیا، چونکہ قرآن مجید کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے عربی زبان کی مستند کتب لغت و تفاسیر کی مدد سے قرآن مجید کے تمام الفاظ کے معانی پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کیے جائیں اور اس کے لیے جہاں تک پیچھے جا سکتے ہوں، جائیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزول قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔(۴۸)

۳۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تصریف آیات سے اپنے مطالب واضح کرتا ہے۔ اس میں اضافہ کہیں اور کیا گیا ہے، استثناء کہیں اور پھر مختلف اہم حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے انہیں سیاق و سباق کی روشنی میں مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔(۴۹)

۴۔ " جن الفاظ کو قرآن حکیم نے بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے۔ ان کا مفہوم بھی قرآن مجید سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات(Concepts) پیش کرتا ہے"(۵۰)

فہم القرآن کے حوالہ سے ایک شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے لکھا:

" باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کر لیں، اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لیے قرآن مجید کی ورق گردانی کریں تو یہ " تدبر فی القرآن" کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے درحقیقت " تدبر فی القرآن" کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن مجید کو اپنے خیالات و تصورات کے تابع لے آنا بہت بڑی جسارت ہے اس سے دلوں پر مہریں لگتی اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں"(۵۱)

پرویز صاحب کی یہ ساری اصول پسندی لفظی اور نظری طور پر بہت خوب ہے۔ ان کی کتب کے بنظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اکثر اوقات اپنے وضع کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں شاید اسی وجہ سے ان کے پیش کردہ نظریات و افکار کو امت مسلمہ کے نمائندہ طبقہ میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ وہ امت مسلمہ کے متفق علیہ نظریات و تصورات کے خلاف ایسا نکتہ نظر پیش کرتے ہیں جو

نیچریت کے از حد قریب ہے۔

جناب پرویز صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ اناجیل اربعہ محرف اور ناقابل اعتماد ہیں، اس موضوع پر آپ کی مستقل کتاب " مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" معیاری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حضرت عیسی علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے کے سلسلہ میں وہ قرآن مجید پر اعتماد نہیں کرتے۔ یا وہ قرآن مجید سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے یا باپ سے پیدا ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ بالآخر وہ محققین یورپ کا دامن تھامتے ہیں۔ وہ قرآن سے پہلے اناجیل اور دیگر مآخذ پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ شعلہ مستور میں لکھتے ہیں:

> " قرآن مجید تک آنے سے پیشتر ہمیں ایک بار پھر اناجیل پر غور کر لینا چاہیئے۔ اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہر حال انہی بیانات کو سامنے رکھا جائے گا"

اس انکشاف سے جناب پرویز کے تضاد افکار کی غمازی ہوتی ہے۔ آپ نے شعلہ مستور میں پورا زور اس بات پر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہیں قرآن کریم بار بار صرف ابن مریم کی نسبت سے پکار رہا ہے اسے ابن یوسف ثابت کیا جائے۔ آپ کے خیال میں ان کے بغیر باپ کے پیدائش کا عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔

آپ کی قرآن فہمی کے سلسلہ میں مرحوم عبدالرحمان طاہر سورتی کا یہ ریمارکس معنی خیز ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ سورتی ہیں جنہوں نے پرویز صاحب کی لغات القرآن کو(Revised)کیا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

> " قرآن مجید کے بارے میں پرویز صاحب ایک نئی تفسیر کر دینے کے عادی ہیں۔اور اس ضمن میں ان کا ایک نپا تلا فقرہ وجہ شادابی قلب بنتا رہتا ہے جس میں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ معنی ہمارے موجودہ زمانہ کے علم کے مطابق کیے گئے ہیں۔ جوں جوں تحقیقات کے بعد علمی سطح بلند ہوگی، ان کے معانی و مفہوم بدلتے رہیں گے"(۵۲)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ (۱۹۱۴ء)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی دور حاضر میں عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین و مصنف ہیں۔ آپ کا زیادہ کام شرق اوسط کے حوالہ سے ہے۔ آپ کا شمار ان چند گنے چنے عجمی مصنفین میں ہوتا ہے جو فی البدیہہ عربی زبان بول اور لکھ سکتے ہیں۔ دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور اس وقت برصغیر کی قدیم اسلامی درس گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم (ریکٹر) ہیں۔ کچھ عرصہ تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ مولانا مودودیؒ کے مشہور رسالہ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر آپ کی معیاری تنقید شائع ہو چکی ہے۔

مولانا نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز تفسیر و عربی ادب کے اسباق سے کیا۔ اس ابتدائی دور میں تفسیر قرآن پڑھاتے وقت جو معلومات طلبہ کے سامنے پیش کیں، اسے مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

مولانا کے اپنے بیان کے مطابق یہ مضامین گویا قرآن مجید کے مطالعہ اور اس سے انتفاع و استفادہ کے لیے اصول و مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں قرآن مجید کا تعارف، اعجاز القرآن اور قرآن مجید اور قدیم آسمانی صحائف کا فرق واضح کر کے دکھلایا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں قرآن مجید سے استفادہ کے موانع بھی بتلائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا ندوی نے تین منفی صفات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ تکبر، مجادلہ اور انکار آخرت۔

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جس طرح صالح سے صالح غذا مختلف انسانی معدوں میں جا کر مختلف اثر کرتی ہے اسی طرح قرآن مجید کا خطاب بھی سب سے یکساں ہے لیکن اس کو قبول کرنے اور اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی۔ چنانچہ تکبر، جھوٹی عزت نفس اور خودداری کا حل ملی جذبہ قبول حق

کے لیے مانع و رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے بحث و مباحثہ کرنا، اس کو اپنی لسانی اور لفاظی سے مغلوب کرنے کی کوشش کرنا اور اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا قرآن کریم کی ہدایت سے محروم رکھتا ہے"۔(۵۳)

مولانا کی رائے میں درج ذیل صفات قرآن فہمی میں مدد و معاون ہو سکتی ہیں، یہ صفات یا اصول بالکل سادہ ہیں جو ایک طالب قرآن کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں:

۱۔ قرآن حکیم سے فائدہ اٹھانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس شخصیت میں طلب ہو۔ جس کو سرے سے اس کی طلب نہیں وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کرے گا اور جو حصہ عمل کے قابل ہو اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ قرآن حکیم بہر حال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے۔ اس سے نفع اٹھانے کا پہلا قدم یہ ہے کہ اسے غور سے سنے اور جو حصہ عمل کے قابل ہو اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۳۔ قرآن مجید کی بنیاد خدا تعالیٰ کے خیال اور اس کے خوف پر ہے جس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو اور جس کے لیے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں وہ گویا دین کے حاسہ سے محروم ہے۔

۴۔ چونکہ دین کا بڑا حصہ مابعد الطبیعات سے متعلق ہے اس لیے یہاں عقل کام نہیں دے سکتی۔ ایسے لوگوں کا ایمان بالغیب میں داخل ہونا مشکل ہے۔

۵۔ قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے تدبر بھی شرط ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا تدبر کی ترغیب دی گئی ہے۔

۶۔ مجاہدہ قرآن فہمی کے لیے مجاہدہ و مشقت بھی ضروری ہے۔ یہ ان انسانی کتابوں میں سے نہیں جن کے مضامین کا احاطہ اور ان کے مصنفین کا مقصد ایک انسان اپنی ذہانت یا علم کی بنیاد پر کر لیتا ہے۔

چونکہ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ عملی ہے وہ محض نظری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ الفاظ و معانی کا علم تو ہو سکتا ہے لیکن تحقیق و مشاہدہ، عمل و تجربہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

۷۔ قرآن مجید سے استفادہ کے سلسلہ میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ محض معلومات کا کوئی دفتر یا قوانین کا مجموعہ نہیں جس کو کسی طرح پڑھ لیا جائے تو اس کے مضامین و مندرجات سے آگاہی ہو جائے گی۔ چونکہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں اس لیے اس کے ساتھ سلوک انسانوں کی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ (۵۴)

مولانا نے یہ اصول و ضوابط ان مسلمان طلبہ کے لیے تحریر کیے تھے جو مدارس و کلیات میں صرف اس لیے داخلہ لیتے ہیں کہ وہ قرآن فہمی کا ملکہ حاصل کر سکیں۔ یہ اصول ان مسلمانوں کے لیے بھی ایک وارننگ کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کتاب کو محض تجرباتی طور پر یا شک کی نظر سے دیکھ کر اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قرآن مجید کے علوم و معارف ان کے دلوں پر دستک نہیں دے سکتے بلکہ الٹا گمراہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا۔

آپ کی یہ تصنیف ان کی دوسری تصانیف کے مقابلہ میں زیادہ گہری نہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی قلمی جولانیاں ایک طرف رکھ کر صرف اپنے مقاصد سادہ زبان میں بیان کر دیئے ہیں۔

مولانا وحید الدین خان (دہلی) (۱۹۲۵ء)

مولانا وحید الدین بھارت کے مشہور شہر دہلی میں قیام پذیر ہیں، آپ کی دو درجن سے زائد کتب اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اپنے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> " میری پرورش اعظم گڑھ کے ایک روایتی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں ہر چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھوں، سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ دین جو " دور قدیم" میں ایک ہزار سال تک انسانی افکار پر حکمران تھا، دور جدید میں ہر لحاظ سے مغلوب ہو گیا ہے تو میرے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ میں اس مسئلہ کی تحقیق کروں۔ میں نے باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ مجھ کو بہت سے لوگ یونیورسٹی کا طالب علم سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میری باقاعدہ تعلیم تمام تر صرف عربی مدارس میں

ہوئی ہے۔ عربی مدارس سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود انگریزی سیکھی۔ بعد کے دور میں انگریزی کتابوں کے مسلسل مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے طرز تحریر پر جدید اسلوب غالب آگیا، اس سے لوگوں کو شبہ ہونے لگا"۔(۵۵)

مزید لکھتے ہیں:

" ۱۹۷۸ء میں میں نے ایک نیا فیصلہ کیا ایک طرف میں نے جدید افکار کو براہ راست مآخذ سے جاننے کی کوشش کی دوسری طرف اسلام کو از سر نو سمجھنے کے لیے قرآن و حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کو پڑھنا شروع کیا"۔(۵۶)

آپ نے تذکیر القرآن " کے نام سے دو جلدوں میں ایک مختصر تفسیر بھی لکھی ہے۔ اس تفسیر کے دیباچہ میں قرآن حکیم کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا:

" قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین کتاب ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ یہ ایک دعوتی کتاب ہے"۔(۵۷)

اپنی اس تفسیر کے دیباچہ میں قرآن فہمی کے حوالہ سے تین شرائط درج کیئے ہیں:

ا۔ آپ کے خیال میں قرآن مجید فکری کتاب ہے اور فکری کتاب میں ہمیشہ ایک سے زائد تعبیر کی گنجائش رہتی ہے، اس لیے قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والا خالی الذہن ہو۔ اگر پڑھنے والے کا ذہن خالی نہ ہو تو وہ قرآن میں اپنی بات پڑھے گا۔ آپ نے اپنی اس فکر کو قرآن مجید کی ایک آیت (بقرۃ:۶۵) میں لفظ اندادو کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ایک شخص جو سیاسی ذوق رکھتا ہو اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا کام سمجھتا ہو وہ جب اس آیت کو پڑھے گا اس کا ذہن پوری آیت میں بس انداد(مدمقابل) پر رک جائے گا اور بقیہ مفہوم کو اپنے ذہن سے جوڑ کر کہے گا کہ اس سے مراد سیاسی مدمقابل ٹھہرانا ہے۔ اس تشریح کی روشنی میں وہ جس کو خدا کا سیاسی

مدمقابل بنا ہوا دیکھے گا اس سے ٹکراؤ شروع کر دے گا۔ آپ کے خیال میں یہاں مدمقابل ٹھہرانے کی جس صورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ باعتبار محبت ہے نہ کہ باعتبار سیاست"۔ (۵۸)

ہماری نظر میں مولانا کی اس وضاحت سے پوری طرح اتفاق ممکن نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اسلام کے سیاسی نظام خصوصاً غلبہ دین سے الرجک ہیں۔ اسلام ہر میدان زندگی میں ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے۔ اسلام کا غلبہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ طاغوتی قوتوں سے نہ ٹکرائے۔

۲۔ آپ کے خیال میں قرآن فہمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس راہ کا مسافر ہے جس راہ کا مسافر قرآن اس کو بنانا چاہتا ہے۔ قرآن آدمی کی عملی زندگی کی رہنما کتاب ہے۔ اس عملی کتاب کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنا اس وقت ممکن ہے جب آدمی عملاً ان تجربات سے گذرے جس کی طرف اس کتاب میں رہنمائی کی گئی ہے، یہ عمل کوئی سیاسی یا سماجی عمل نہیں بلکہ مکمل طور پر ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اس موقعہ پر آکر وہ نفسیاتی عمل کی جائے مذہبی تجربہ کہہ دیتے تو بات زیادہ مناسب تھی۔

۳۔ قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقتاً کوئی نظام قائم کرنے کا مشن نہیں بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج"۔ (۵۹)

ہمارے خیال میں مولانا کے اس نکتہ سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام اور قرآن کا مقصد یہی ہے کہ جب افراد کی تعداد زیادہ ہو جائے تو وہ ایک ایسا معاشرہ ترتیب دیں جہاں حقوق اللہ حقوق العباد کی پوری طرح نگہداشت کی جائے۔ وہ اس خطہ ارض میں نظام صلوۃ و زکوۃ جسماً نافذ کریں گے۔ یہ سب صورتیں سماج کے حوالہ سے وجود میں آئیں گی۔ ورنہ آنحضور ﷺ کو مدینہ پہنچ کر ریاست کا عملی نقشہ پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ خاموشی سے افراد کی تربیت کرتے، کسی سے محاذ آرائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اگر اسلام انفرادی اصلاح کا نام ہے تو مکہ کے باسی آپ کی مخالفت اس حد تک نہ کرتے کہ آپ ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

ڈاکٹر اسرار احمد (لاہور) (۱۹۳۲ء)

دور حاضر میں ڈاکٹر اسرار احمد قرآنی فکر پھیلانے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ اصل میں میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ اپنی خداداد ذہانت، اردو زبان پر خصوصی دسترس اور قرآنی دلچسپی کی وجہ سے مخصوص حلقوں میں خاصے جانے پہچانے ہیں۔ آپ نے قرآنی تعلیمات عام کرنے میں طویل جدوجہد کی۔ آپ کی ذاتی کوششوں کی بدولت اس وقت قرآن اکیڈیمی اور قرآن کالج سامنے آچکے ہیں۔ قرآن فہمی کے حوالہ سے آپ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودیؒ کی فکر سے متاثر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شبیر احمدؒ عثمانی کی تفاسیر بھی آپ کے پیش نظر ہیں۔ آپ فکر اقبال اور جدید سکالرز کے موقف سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ آپ کا خطیبانہ انداز ایک خاص نہج اختیار کر چکا ہے جو خصوصی طور پر تعلیم یافتہ اذہان کو متاثر کرتا ہے۔

آپ نے اپنے مطالعہ و تجربہ کے بعد قرآن فہمی کے حوالہ سے جو اصول پیش کیے وہ یہ ہیں:

۱۔ تذکر و تدبر: ــ قرآن حکیم کا یہ حق ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ پھر فہم قرآن کوئی سادہ اور بسیط چیز نہیں بلکہ اس کے بے شمار مدارج و مراتب ہیں اور ہر انسان علم کے اس اتھاہ و ناپیدا کنار سمندر سے اپنی فطری استعداد، ذہنی ساخت، طبیعت کی افتاد، پھر اپنی اپنی سعی محنت و مشقت، کدو کاوش اور تحقیق و جستجو کے مطابق حصہ پا سکتا ہے۔ چاہے پوری کی پوری عمر قرآن پر تدبر و تفکر میں بسر کر دے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی مرحلہ پر پہنچ کر وہ سیر ہو جائے۔ ذکر و تذکر یہ قرآنی اصطلاح فہم قرآن کی اوّلین منزل کا پتہ دیتی ہے اور اس کی اصل غایت اور حقیقی مقصود کا سراغ بھی اس سے ملتا ہے۔

۲۔ تذکر بالقرآن کے لیے عربی زبان کا بنیادی علم بہر حال ناگزیر ہے۔ متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخہ میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لیے ناکافی ہے۔

۳۔ فہم قرآن کا دوسرا مرتبہ تدبر قرآن کا ہے یعنی یہ کہ قرآن مجید کو گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس کے علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی کوشش کی جائے۔ قرآن جس طرح عوام کو کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں صحیح نکتہ نظر اور

زندگی بسر کرنے کی واضح ہدایات عطا کرتا ہے۔ اسی طرح خواص اور اصحاب علم و فکر کے لیے کامل ہدایت اور مکمل رہنمائی ہے۔ڈاکٹر صاحب کے خیال میں تذکر کے اعتبار سے قرآن مجید جس قدر آسان ہے واقعہ یہ ہے کہ تدبر کے نکتہ نظر سے یہ اسی قدر مشکل ہے۔ قرآن مجید کو بطریق تدبر پڑھنے کی شرائط بڑی کڑی ہیں اور ان کا پورا کرنا اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ ایک انسان اپنے آپ کو بس اس کے لیے وقف کر دے۔ اس کے لیے اولاً عربی زبان کے قواعد کا گہرا اور پختہ علم ضروری ہے۔ پھر اس کے لوب کا ستھرا ذوق اور فصاحت و بلاغت کا عمیق فہم لازمی ہے۔ اس کے علاوہ نظم قرآن کا فہم جائے خود تدبر قرآن کے راہ کی ایک کٹھن منزل ہے۔ اولاً سورتوں پھر سورتوں کی آیتوں کے باہمی ربط و تعلق کا سمجھنا ایسا مشکل مرحلہ ہے جس پر بڑے بڑے اصحاب عزم و ہمت تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

۴۔ ساتھ ہی قرآن کو سمجھنے کے لیے احادیث کے تمام ذخیرہ پر انسان کی گہری نظر بھی لازمی ہے اور قدیم صحف سماوی کا گہرا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ خلاصہ یہ کہ تدبر قرآن کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اصحاب ہمت اور ارباب عزیمت کی ایک بڑی جماعت اپنے آپ کو پوری طرح کھپا کر ایک طرف تدبر قرآن کی متذکرہ بالا جملہ شرائط کو پورا کرے اور دوسری طرف علوم عقلی و عمرانی کی گہری و براہ راست مہارت بہم پہنچائے۔(۶۰)

ڈاکٹر اسرار احمد کے مذکورہ چاروں اصول قدیم و جدید فکر کا امتزاج پیش کر رہے ہیں۔ چونکہ خود ان کا تعلق جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے اس لیے آج اگر کوئی جدید فکر سے آراستہ انسان اس انداز میں قرآن فہمی کی کوشش کرتا ہے تو اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ قرآنی علوم سے پوری طرح آشنا ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ تصور بہت حد تک ختم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ماہر صرف قدیم انداز کے اساتذہ و علماء ہی ہوتے ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اس فن میں مہارت حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ میڈیکل سائنسز کا طالب علم بھی قرآن فہمی میں درک حاصل کر سکتا ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (لاہور) (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ بعد میں کثرت مطالعہ کے باعث جدید فکر کے بانی کہلائے۔ ۱۹۴۱ء میں پٹھان کوٹ (بھارت) میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور وہیں اپنا ماہنامہ ترجمان القرآن کے نام سے شائع کیا۔ تقسیم کے بعد مستقل طور پر لاہور منتقل ہوگئے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اردو زبان میں قرآن مجید کی ایک عام فہم تفسیر لکھی جائے جس کے لیے انہوں نے کچھ اصول بھی مرتب کر لیے تھے جو بعد میں قرآن فہمی کے اصول کے نام سے ایک چھوٹے رسالہ کی شکل میں شائع ہوئے۔ بعد میں انہی مضامین کو تفہیم القرآن جلد اوّل کے مقدمہ میں سمو دیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن فہمی کے حوالہ سے ایک اور رسالہ " قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" لکھا جس پر علماء کی جانب سے خاصی تنقید کی گئی۔

مولانا مودودی کی تفسیر " تفہیم القرآن " ۳۰ برس کے عرصہ میں چھ جلدوں میں شائع ہوئی اور اسے عوام الناس خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں خاصی مقبولیت ملی۔ ہم نے یہاں اولاً مولانا کے فہم القرآن کے حوالہ سے پیش کردہ اصول اور آخر میں چار بنیادی اصطلاحوں پر علماء کی تنقید اور اس کا جائزہ پیش کیا ہے۔

مقدمہ تفہیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا ایک نفسیات دان کی طرح جدید فکر سے متاثر اذہان کے ذہنی اشکالات سے پوری طرح باخبر ہیں، کہ جب ایسے شخص قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں اپنے اشکالات کے جوابات نہیں ملتے۔ کچھ افراد اسے بابرکت کتاب سمجھ کر صرف تلاوت پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے اشخاص پھر اس کی طرف رخ التفات ہی نہیں کرتے۔

چنانچہ اس اشکال کو پیش نظر رکھ کر آپ نے لکھا:

" عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات ، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے

ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بناء پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن کریم سے اب تک اجنبی رہا ہے اور پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ کتاب ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر مضمون ابواب و فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ پر بحث ہوگی۔۔۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے خلاف ایک دوسرے ہی انداز سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک ناآشنا تھا"(۶۱)

اس شبہ کی مزید وضاحت کچھ اس طرح کی

جو شخص قرآن مجید میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اس پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ قرآن کے مبادی سے ناواقف ہے۔ اس کی مثال اس اجنبی مسافر کی طرح ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس کو گم گشتگی سے بچایا جا سکتا ہے اگر اسے یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ دنیا کے تمام لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک منفرد کتاب ہے، اس کی تصنیف دنیا کی ساری کتابوں سے مختلف ہے۔(۶۲)

پھر اس قاری کے لیے یہ امور تجویز کیے :

قرآن کا قاری اس حقیقت کو محسوس کرے کہ قرآن مجید کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔

مولانا کے خیال میں اس کتاب کا اسلوب تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی ہے جسے دل و دماغ، عقل اور جذبات ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے اور ہر قسم کی ذہنیتوں

سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر جو پیغامات نازل کیے ان کا طرز خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسب حال ہوتا ہے۔ اس میں یونیورسٹی کے لیکچروں کا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔(۶۳)

عام قاری کے اس Misconception کی وضاحت کے بعد یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن کی اصل کیا ہے، اس کا موضوع کیا ہے وغیرہ۔ اگر یہ تینوں امور قاری کے ذہن میں ہوں تو وہ مطالعہ قرآن کے دوران یہ محسوس کرے گا کہ قرآن ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مقاصد سے دور نہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا نے ایک اور نکتہ پر خاصا زور دیا ہے کہ ایک قاری کے ذہن میں قرآن مجید کا پس منظر موجود ہونا چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے نظم قرآن کو پیش نظر رکھ کر اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

دعوت کے پہلے مرحلہ میں جب کہ اس کے مخاطب چند افراد تھے جن کے لیے یہ عمل و طریق کار نیا تھا۔ چنانچہ یہ پیغامات ابتدائی دعوت کی مناسبت سے بہت چھوٹے بولوں پر مشتمل تھے۔ جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت پر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق اولی رنگ لیے ہوئے تھی۔ تاکہ دلوں میں یہ بول نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہو اور زبانیں اس کے حسن تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دہرانے لگیں۔

دعوت کے دوسرے مرحلہ میں جب یہ پیغام مکہ و قریش کی حدود سے نکل کر زیادہ وسیع حلقہ میں پہنچنے لگا، اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پرجوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کیے جس میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔

دعوت کا تیسرا مرحلہ جس کا آغاز ہجرت سے ہوا۔ اس مرحلہ میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ اب امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بناء ڈالنے میں کامیاب ہوئی۔ اس منزل میں اس کی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے

جس کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تدریس اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا۔(۶۴)

مولانا کے پیش کردہ قرآن فہمی کے یہ چاروں نکات اس قدر جامع اور دلنشیں ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کا یہ طریق تفہیم بالکل اچھوتا ہے۔

اس موقعہ پر یہ کہنا ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سورۃ کے پس منظر میں مخصوص حالات ہوتے ہیں، ان حالات کو جانے بغیر کسی بھی سورت کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔

قرآن فہمی کے حوالہ سے آپ کی دوسری مستقل تصنیف "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" ہے۔ اس کتاب پر کئی حلقوں کی جانب سے خاصی تنقید کی گئی۔ مولانا نے اس کتاب کے مقدمہ ، اس کی وجہ تصنیف یہ بیان کی ہے :

> " الہ،رب،دین اور عبادت یہ چاروں لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص نہ جانتا ہوں کہ الہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے اور دین کسے کہتے ہیں۔ تو دراصل اس کے لیے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا"۔

عرب جو اوّلین مخاطب تھے اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الہ کے کیا معنی ہیں، رب کسے کہتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے۔

بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزول کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک ہر ایک پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہوگیا۔

مولانا کے خیال میں اس کی ایک خاص وجہ خالص عربیت کی ذوق کی کمی تھی۔ مولانا کے الفاظ میں اس غلط فہمی کے نتائج یہ ہوئے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی روح

نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔(۶۵)

اس سے پہلے کہ ہم اس رسالہ پر علماء کی تنقید اور اس کا جائزہ پیش کریں۔ مولانا کے افکار سے متاثر ایک مصنف کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

"کیوں کہ مولانا غیر اسلامی قوانین کو اور غیر مسلم حکومت کی اطاعت کو بھی شرک میں داخل سمجھتے ہیں۔ مولانا کے اس موقف کی علماء کے ایک طبقہ نے مخالفت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا مودودی اس معاملہ میں ضرورت سے زیادہ سخت ہیں"۔(۶۶)

ثروت صولت کے خیال میں یہ حقیقت ہے کہ اصولی طور پر مولانا مودودی کے دلائل کا جواب آسان نہیں۔ مولانا مودودی کے اس رسالہ پر سب سے بہتر اور محتاط تبصرہ سیّد ابوالحسن علی ندوی کا ہے۔ آپ نے اس رسالہ کی اشاعت کے بہت عرصہ بعد اپنی (Observation)عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح، کے نام سے شائع کی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ انتہائی عالمانہ انداز اور مناظرہ بازی کے طریق کار کی یکسر نظر انداز کر کے لکھی گئی ہے۔

مولانا ندوی کے خیال میں دورِ حاضر میں اس دین لبدی کے وفاداروں اور خدمت گذاروں اور اس کے ترجمان و شارحین کا فرض یہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں دین کی تفہیم و تشریح اس طرح کریں کہ ان لبدی و قدیم عقائد و حقائق پر نئی نسل کے قلوب میں نیا ایمان اور اس کے دماغوں میں نیا اذعان و اطمینان پیدا ہو۔ لیکن یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل اور نازک بھی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی تصویر و تمثیل میں وہ اس دینی مزاج سے مختلف نہ ہونے پائے جو آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تربیت اور صحبت سے صحابہ کرام کا بنا تھا۔

اسلامی تاریخ میں عصر حاضر کے مطابق دین کی تفہیم و تشریح کا کام کرنے والوں نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اس طرح اس امت کا ذہنی و فکری رشتہ اسلامی عقائد، حقائق اور تصورات سے ٹوٹنے نہ پایا۔(۶۷)

مولانا ندوی، مولانا مودودی کے بیشتر علمی کاموں سے مطمئن نظر آتے ہیں کہ انہوں نے مغربی تہذیب اور فلسفہ حیات کی تنقید و تردید میں مدافعانہ کی بجائے جارحانہ انداز اختیار کیا اور انہوں نے ان مسائل و مباحث پر مؤثر مضامین لکھے جو تجدد پسندوں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہوئے تھے۔

مولانا ندوی کی تنقید کے بنیادی نکات تین ہیں:

۱۔ مولانا ندوی کے خیال میں مولانا مودودی نے دوسرے علمی کاموں کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید کے طرز کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اسلام اور قرآن کی ایک نئی تفسیر کا نمونہ پیش کیا جس پر سیاسی رنگ غالب ہے اور وہ حاکمیت الٰہ اور سلطانی رب کے گرد گھومتی ہے۔

مولانا ندوی نے یہ پیش گوئی کی کہ اس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جو نسل ان تحقیقات و خیالات کے سایہ میں پروان چڑھے گی اس کا ذہنی رابطہ کسی اور ماحول سے نہ ہوگا۔ اس کا ایک نیا دینی مزاج بن جائے گا جو اس مزاج سے مختلف ہوگا جس کو صحبت و تربیت نبوی اور صحابہ کرام کی اقتداء نے تیار کیا۔ اس طرح اس فکر و سعی کی گاڑی اس پٹڑی سے ہٹ کر جس پر آنحضرت ﷺ، صحابہ و تابعین نے ڈالا تھا دوسری پٹڑی پر پڑ جائے گی۔

۲۔ مولانا ندوی کی نظر میں اس طرز فکر کا دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اس سے امت کی گذشتہ تاریخ، اس کے مجددین، مصلحین اور مجتہدین کے علمی و عملی کارنامے بھی مشکوک و کم قیمت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے ڈانڈے فرقہ باطنیہ سے جا ملتے ہیں جو عام دینی اصطلاحات کی تشریح اپنے انداز فکر کے مطابق کرنے کے عادی تھے۔

۳۔ اس طرز تحقیق و طرز کلام سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ امت پر ایسا طویل دور گذرا ہے جب وہ قرآن مجید کے ایسے اہم بنیادی اصطلاحات کے صحیح مفہوم اور مضمرات سے ناآشنا رہی جس پر اس کی صحت فکر اور صحت عمل کا دارومدار ہے جب کہ احادیث کے ذخیرہ سے اصولی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امم سابقہ کے برخلاف یہ امت کسی دور میں عمومی و عالمگیر ضلالت میں مبتلا نہ ہوگی۔(۶۸)

ہماری ذاتی رائے میں دونوں حضرات چودھویں ہجری کے Leading Scholars ہیں اس لیے ان کے نظریات و افکار پر رائے زنی کرنے سے عجلت نہ کی جائے۔ یقیناً دونوں اپنے مخصوص ذہن اور طریق فکر کی بناء پر مخلص ہیں اور وہ ہر حال میں اسلام کی سربلندی کے خواہاں ہیں لیکن طریق ادا میں اختلاف ہے۔ اس امت کا فکری اختلاف یقیناً رحمت ہے اگر مقاصد تعمیری ہو۔

مولانا ندوی کے اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرز فکر سے جو نوجوان متاثر ہو کر عملی زندگی میں حصہ لیں گے ان میں محبت و رضاء الٰہی اور فلاح اخروی کے تصورات سیاسیات حاضرہ کے نیچے دب کر رہ جائیں گے اور طلب عزت اور شوق اقتدار انہیں بالآخر مادیت کی گود میں لے جائے گا۔

مولانا مودودی کے افکار پر بالعموم اور چار بنیادی اصطلاحوں پر بالخصوص دوسری تنقید مولانا وحید الدین(بھارت) کی جانب سے ہوئی جو ۱۹۶۱ء تک جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن بھی رہے۔ آپ کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے:

> "کارل مارکس نے جس طرز پر زندگی اور اس کے واقعات کی تشریح کی ہے۔ اس میں معاشی پہلو تمام چیزوں پر غالب آگیا ہے۔ اس طرح مولانا مودودی نے جس ڈھنگ سے دین کو پیش کیا ہے۔ اس میں ہر چیز پر ایک قسم کا سیاسی رنگ چھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر ان کے فکر کو دین کی سیاسی تعبیر کا نام دیا جائے تو یہ بڑی حد تک ایک صحیح بات ہوگی" (۶۹)

ان کے خیال میں اس تعبیر سے سیاست کا پہلو اس طرح ابھر آیا ہے کہ وہی پورے مجموعہ کا مرکزی نقطہ بن گیا ہے۔ مولانا وحید الدین نے مولانا ندوی کے پیش کردہ ریمارکس کو اپنے انداز میں پیش کیا:

> "اس طرح زیر بحث فکر کو اپنی تسکین کا سامان تو مل گیا مگر اس سے اسلامی تاریخ کی نوعیت بدل گئی۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں کم از کم نظریاتی طور تسلسل پایا جاتا ہے۔ مگر اب یہ معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ صحیح نہ تھا۔ کیوں کہ اسلامی تاریخ اپنے طویل ترین مدت میں ایک زبردست خلاء

سے دوچار رہی ہے"(۷۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ افراط و تفریط دونوں اپنی جگہ پر ناپسندیدہ ہیں۔ اسلام میں عبادات میں خلوص و پابندی پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا جتنا اس کی زمین پر اللہ کے قانون نافذ کرنے پر۔ ان دونوں میں سے جس پہلو کو کمزور کیا جائے گا دین کی اصل اور اس کی روح ماند پڑ جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان عبادات کو چھوڑ کر صرف سیاسیات کو اوڑھنا بچھونا بناتا ہے، ایسی سیاست اسے بالآخر طاغوت کی طرف لے جائے گی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے انسان اپنے آپ کو عبادات کے حوالہ سے پوری طرح مسلح کرے پھر کائنات کو درست کرنے کا عزم لے کر باہر آئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی (لاہور) (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۷ء)

مولانا اصلاحی اعظم گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے فراغت ہوئی۔ آپ کا شمار مشہور مفسر مولانا حمید الدینؒ فراہی کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک سرائے میر میں قیام کیا۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور صحافی کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لائے۔ ۱۹۵۷ء تک جماعت میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنے طور پر علمی کام کیے، تدبر قرآن کے نام سے نو جلدوں میں ضخیم تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ آپ کئی کتابوں اور مقالات کے مصنف بھی ہیں۔

تفسیر قرآن لکھنے سے پہلے، آپ نے قرآن فہمی کے حوالہ سے ایک چھوٹا رسالہ تدبر قرآن کے نام سے شائع کیا، تفسیر شائع ہونے کے بعد اسے مبادی تدبر قرآن کہا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے آغاز میں مولانا اصلاحی نے فہم قرآن کے لیے چند ابتدائی شرطیں لکھی ہیں۔ یہ اصول ایک عام انسان کے لیے ہیں جو قرآن پاک کو سمجھنا چاہتا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ نیت کی پاکیزگی۔

۲۔ قرآن مجید کو ایک عظیم تر کتاب و معجزہ ماننا، نہ کہ صرف فقہی ضابطہ سمجھنا، یا اچھی نصیحتوں کا مجموعہ

۳۔ اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ تدبر ، مولانا کے خیال میں دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے اس امر پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے۔

۵۔ قرآنی مشکلات کے وقت انسان بددل و مایوس نہ ہو۔ اپنی الجھنیں خدا کے سامنے پیش کرے اور اس سلسلہ میں اس سے دعا کرے۔(۷۱)

مولانا اصلاحی نے مبادی تدبر قرآن میں چار قدیم تفاسیر یعنی ابن جریر طبری کی تفسیر، ابن کثیر، امام رازی کی مفاتیح الغیب اور علامہ زمخشری کی الکشاف عن حقائق التنزیل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر سخت تنقید کی اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

> " دور اوّل میں تفسیر قرآن کی راہ میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا۔ اس کا محرک اگرچہ خیال تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔ اہل بدعت اور اہل باطل کی مطلق العنانیوں اور فتنہ آرائیوں سے بچنے کے لیے روایات و آثار کو اہمیت دی گئی لیکن پھر روایات میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ ان کے بارے میں نقد و تمیز کی آنکھیں بند ہوگئیں اور آہستہ آہستہ صحیح روایات کے ساتھ قصوں اور اسرائیلیات کا ایک بڑا حصہ بھی تفسیر کی کتابوں میں داخل کر دیا گیا"(۷۲)

اس اقتباس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی پورے تفسیری لٹریچر سے مطمئن نہیں وہ اپنی کسی تحریر میں کسی ایک تفسیر کی نشاندہی نہیں کر سکے جو ان کے ذوق قرآن فہمی پر پوری اترتی ہو، عقل سلیم یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے پورے چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں ایک مفسر بھی قرآن مجید کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکا۔

اس کے علاوہ آپ آیت ویعلمھم الکتاب والحکمۃ و یزکیھم(۲:۱۲۹) میں لفظ حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے، مولانا اصلاحی عام علماء کی طرح یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حکمت سے مراد احادیث نبوی ہیں۔ آپ نے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

کہ کسی طرح بھی لفظ حکمت سے مراد حدیث یا قرآن سے باہر کوئی شئے ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا۔

واذ علمتک الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل۔

بقول مولانا اصلاحی اس آیت میں کتاب اور حکمت کے الفاظ کے بعد توریت اور انجیل کے الفاظ بطور تشریح آئے ہیں۔ لفظ کتاب کی تشریح توریت اور حکمت کی تشریح انجیل کے لفظ سے کی گئی ہے، اہل علم جانتے ہیں۔ کہ توریت زیادہ تر احکام و قوانین پر مشتمل ہے اور انجیل دلائل و نصائح کا مجموعہ ہے۔

توریت کو اس کی قانونی اہمیت کی وجہ سے کتاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور انجیل کو اس کی حکمتوں اور نصیحتوں کی وجہ سے حکمت کہا گیا۔ ان وجوہ کی بناء پر حکمت سے حدیث مراد لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔(۷۳)

ہم مولانا کی اس رائے سے دو وجوہات کی بناء پر متفق نہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ اگر وحی متلو کو ہی حکمت تسلیم کریں تو غیر متلو اسی پیغمبر علیہ السلام کی زبان مبارک سے ملی ہے وہ حکمت کیوں نہیں ہو سکتی۔ ایک کو حکمت ماننا اور دوسرے کو بلند مرتبہ مان کر حکمت نہ ماننا عقل و فہم سے کوسوں دور ہے۔ جب کہ علماء امت متفق ہیں کہ حکمت سے مراد نبی کا خاص فہم ہوتا ہے جس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اس خاص فہم کو پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ وحی خفی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔(۷۴)

مولانا اصلاحی نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ موجودہ توریت جو اس وقت ہمارے ہاں مروج ہے قوانین الٰہی کا مجموعہ ہے اور انجیل صرف پند و نصائح پر مشتمل ہے اس لیے وہ حکمت ہے۔ ہمارے خیال میں ایسا کہنا اس لیے درست نہیں کہ تاریخ صحف سماوی کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اصل توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح کی شکل میں دی گئی تھی لیکن وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف انسانی آفتوں کا شکار ہوتی رہی، بہر حال اس میں کچھ گنجائش ہے کہ دور حاضر کی توریت میں کسی حد تک قوانین

الہی موجود ہوں۔ لیکن انجیل کا مسئلہ اس سے دگرگوں ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دنیاوی زندگی میں اپنی انجیل کو املا کرایا تھا(ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اپنے ایک لیکچر میں اس طرف اشارہ کیا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ چاروں اناجیل کسی حد تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ ان میں ایک فی صد بھی کلام الہی موجود نہیں۔ پھر یہ کتابیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے طویل عرصہ بعد لکھی گئیں۔ مولانا کا یہ کہنا اس وقت درست ہوتا کہ اناجیل اپنی اصل حالت میں موجود ہوتیں۔ موجودہ اناجیل جدید تنقید کی روشنی میں انتہائی مشکوک ہیں۔

تفسیر تدبر قرآن مولانا اصلاحی کی پچپن سالہ کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ بقول ان کے یہ صرف میرا ہی فکر نہیں بلکہ میرے استاد کا بھی فکر ہے۔ اس تفسیر میں قرآن مجید پر غور اور اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے براہ راست (Direct Approach) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی تفسیر کا اصل ماخذ قرآن کی زبان، اس کی آیات کے نظام اور اس کے اپنے اندرونی نظائر و شواہد کو قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح قدیم آسمانی صحائف سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مولانا اصلاحی نے مبادی تدبر قرآن میں تفسیر کے صحیح اصول کے تحت اس کے چار اصول بیان کیے ہیں۔ جن کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ صحیح اور قطعی ہیں۔ اور یہی وہ اصول ہیں جو سلف صالحین نے قرآن مجید کی تاویل میں پیش نظر رکھے۔ یہ یاد رہے کہ اس سے قبل مولانا نے صراحۃ تفسیری سرمایہ سے غیر مطمئن ہونے کی طرف اشارہ کیا اس سے ان کے تضاد افکار کی نشاندہی ہوتی ہے :

۱۔ تفسیر کا ماخذ اوّل اس زبان کو بنایا جائے جس زبان میں قرآن مجید اترا ہے۔ اس سے مراد عام عربی زبان نہیں جو عام طور پر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے لیے ہمیں امرؤالقیس، لبید، زہیر، عمرو بن کلثوم اور عرب کے خطباء جاہلیت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اور اس کام میں اتنی مہارت حاصل ہو جائے کہ اصل و نقل میں امتیاز ہو سکے۔ اس کے اسالیب و محاورات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ظاہر ہے یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن جو لوگ قرآن حکیم کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ جب تک اس مشکل کو آسان نہ بنائیں گے وہ قرآن مجید کے فہم میں تفاسیر و تراجم کی خوشہ چینی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

۲۔ قرآن مجید کے سمجھنے میں فیصلہ کن عامل کلام کا نظم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورۃ کا خاص عمود یا موضوع ہوتا ہے اور سورۃ کی تمام آیات نہایت حکیمانہ مناسبت اور ترتیب کے ساتھ اس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ سورۃ کے بار بار مطالعہ سے جب سورۃ کا عمود واضح ہو جاتا ہے اور سورۃ کی آیات کا تعلق بھی اسی عمود کے سامنے آ جاتا ہے تو پوری سورت متفرق آیات کا ایک مجموعہ ہونے کے بجائے ایک نہایت حسین وحدت بن جاتی ہے۔

۳۔ قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن مجید اپنے آپ کو کتابا متشابھا کہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ہر حصہ دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ قرآن مجید میں اگر ایک ہی بات اجمال کے ساتھ آئی تو دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ ۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک بات اگر ایک جگہ سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری یا تیسری جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

۴۔ تفسیر کا چوتھا ماخذ سنت متواترہ و مشہورہ ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے مثلاً صوم، حج، عمرہ وغیرہ ان سب کی تفسیر سنت متواترہ کی روشنی میں کرنی چاہیئے۔ ان اصطلاحات کے معنی بیان کرنے کا حق آنحضور علیہ السلام کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ ان ساری اصطلاحات کا مفہوم بالکل عملی شکل میں سنت متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔(۷۵)

مولانا اصلاحی کے بیان کردہ چاروں اصول بہت حد تک ایسے ہیں جن کی روشنی میں تفاسیر قرآن لکھی جاتی رہیں۔ البتہ دوسرا اصول نظم قرآن مولانا اصلاحی و فراہی کا ایک قابل ذکر کارنامہ ہے جو اردو تفاسیر میں نظر نہیں آتا۔ خود مولانا نے یہ اعتراف کیا ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ اس رمز، سلیقہ کو اس تفسیر میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کے خیال میں یہی چیز فہم قرآن میں سے سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس تفسیر میں قرآن مجید پر غور کرنے کی راہ میں نے کھول دی ہے۔

نظم قرآن کا یہ پہلو ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے ہم مولانا کے افکار کی روشنی میں اسے بالتفصیل پیش کر رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کی فکر کے مطابق فہم قرآن کے لیے دو وسائل ناگزیر ہیں۔

۱۔ اندرونی: قرآن کی زبان، قرآن کا نظم، قرآن کے نظائر و شواہد

۲۔ بیرونی: حدیث و تاریخ، سابق آسمانی صحیفے، تفسیر کی کتابیں

کسی اعلیٰ کلام کا حسن و جمال اس کے نظام اور اس کی ترتیب کے اندر مضمر ہوتا ہے جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور مفرد قسم کی ہدایات، اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورۃ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو وہ اس حکمت سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

اندرونی نظم سے مراد یہ ہے کہ ہر سورۃ ایک مستقل وحدت ہے اس کا ایک علیحدہ عنوان، موضوع (عمود) ہے اس سورۃ کے تمام اجزاء اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ (۷۶)

نظم قرآن کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں بعد میں مدنی سورتیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے۔ مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں فاتحہ مکی باقی چار مدنی۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے۔ انفال اور توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے ۱۴ سورتیں، یونس تا مومنون مکی ہیں آخر میں سورہ نور مدنی ہے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ ۸ سورتیں مکی، آخر میں ایک احزاب مدنی۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے حجرات پر ختم۔ اس میں ۱۳ مکی۔ آخر میں تین مدنی۔

چھٹا گروپ سورۃ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلی سات مکی اس کے بعد دس مدنی۔

ساتواں گروپ سورۃ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔

مولانا اصلاحی کے خیال میں سورتوں کی زمرہ بندی(Grouping) جس حکمت پر مبنی ہے اس کا اصلی حسن و جمال مخفی ہے۔ مولانا نے اس اخفاء کی طرف ان نکات میں اشارہ کیا ہے۔

۱۔ جس طرح ہر سورۃ کا ایک خاص عمود ہے جس سے سورۃ کے تمام اجزاء کلام وابستہ ہیں۔ اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں موجود ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔

۲۔ ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں وہ اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہمرنگ ہیں۔

۳۔ ہر سورہ زوج زوج ہے یعنی ہر سورۃ اپنا ایک جوڑا اور مثنی بھی رکھتی ہے۔ ان دونوں میں اس طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلاء کو پر کرتی ہے۔ اس طرح دونوں مل کر سورج اور چاند کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔

۴۔ یہاں یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو دوسرے تمام گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور نذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔(۷۷)

اردو زبان کے تفسیری لٹریچر میں نظم قرآن کے حوالہ سے کوئی تفسیر موجود نہیں۔ عربی زبان میں اس موضوع پر چند تفاسیر موجود ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنے مقدمہ

تفسیر میں ان کے نام گنائے ہیں۔

مثلاً ابو جعفر بن زبیر، شیخ ابو حیان کی البرہان فی مناسبۃ ترتیب سورالقرآن اور شیخ برہان الدین بقاعی کی نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح علامہ مخدوم مھائمی کی تبصیر الرحمن و تیسیر المنان بھی انتہائی اہم ہے۔ ان کتابوں کے متعلق مولانا اصلاحی لکھتے ہیں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔(۷۸)

نظم قرآن کی اہمیت کے سلسلہ میں مولانا فراہی کا یہ ریمارکس فکر انگیز ہے۔

" اگر ہم نظم کلام میں بے پروائی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصہ سے محرم ہو جانے کا اندیشہ ہے"(۷۹)

اسی طرح آپ کا یہ کہنا کہ اگر ہر سورۃ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی؟

مولانا اصلاحی کی تفسیر تدبر القرآن کی مجموعی خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند باتیں ایک قاری کو کھٹکتی ہیں مثلاً تدبر قرآن کی جلد چہارم میں سورہ نور کے ضمن میں مولانا اصلاحی نے رجم کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ اس سے بقول ڈاکٹر اسرار احمد وہ اہل سنت کی صفوں سے نکل کر منکرین حدیث یا خوارج کی صف میں آگئے ہیں۔(۸۰) اسی طرح سورہ فیل کی تفسیر میں مولانا فراہیؒ اور اصلاحی دونوں آیت ترمیہم میں ترمی کا فاعل اہل مکہ اور اہل عرب کو قرار دیتے ہیں جو الم تر کے مخاطب ہیں۔ پرندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھائیں۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے جمہور مفسرین سے اختلاف کیا ہے۔ تقریباً تمام مفسرین ترمی کی ضمیر طیر کی طرف راجع کرتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا اس فعل کو معجزہ خداوندی کی بجائے ایک عام فعل قرار دے رہے ہیں کہ قریش ان پر سنگ باری کر رہے تھے اور ابرہہ کی فوج اس سنگ باری کی وجہ سے

بھس بن گئی۔ اس تاویل سے مولانا کا ایک مقصد تو پورا ہوا لیکن اس تاویل سے چند باتیں ایسی سامنے آئی ہیں جو ناقابل تسلیم ہیں۔

۱۔ عرب عام طور پر آمنے سامنے لڑنے کا عادی تھے۔ ان کے ہاں چھپ کر لڑنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ مولانا نے اپنی دلیل میں جنگ احزاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ کہنا اس لیے درست نہیں کہ ۶۰ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس کا کام نہ تھا۔ وہ تو غزوہ احزاب کے موقعہ پر بڑی تیاریوں کے بعد مشرکین عرب اور یہودی قبائل کی جو فوج لائے تھے وہ دس بارہ ہزار سے زائد نہ تھی۔ پھر بھلا وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے تھے۔

۲۔ سنگ باری کے لیے مخصوص قسم کے آلات کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ ابرہہ کی فوج آنے کے بعد عبدالمطلب اور قریش نے مزاحمت کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ قریش اس کا مقابلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا انتظام خود کیا۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی اور بیشتر شعراء نے اسے اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔ ان قصائد سے یہ بات نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا۔(۸۱)

اس کے علاوہ گذشتہ انبیاء کے صحائف اور کتب سے استدلال کرنے میں مصنف کی نظر نسبۃً زیادہ ہے۔ بعض دفعہ قارئین کو ان حوالوں کی کثرت اور ان محرف کتابوں سے کثیر تعداد میں استدلال کھٹکتا ہے۔

خلاصہ بحث :

فہم القرآن کے حوالہ سے جتنا کام اب تک سامنے آیا، اس مختصر مقالہ میں اسے مکمل طور پر سمونا اور پھر اس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ ہم یہاں صرف نمائندہ مصنفین و مفسرین کی آراء کو زیر بحث لا سکے۔ اس مطالعہ سے عمومی تاثر یہ ہے :

۱۔ فہم القرآن کو بہت کم مصنفین و مفسرین نے موضوع بحث بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں اردو زبان میں بہت کم لکھا گیا۔

۲۔ اس مطالعہ سے اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس فن میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ متقدمین کے کام کو اپنے دور کے حوالہ سے مزید آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

۳۔ چونکہ ہر مفسر یا مصنف اپنے مخصوص زمانہ، ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اس لیے وہ اس سے لاشعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ قرآن مجید کا مطالعہ اسی تناظر میں کرتا ہے، اس کے ذاتی ذوق پر جس فن کا غلبہ ہوگا وہ قرآن مجید کی تفسیر اسی رنگ میں کرنا پسند کرتا ہے۔

۴۔ ایک چیز جو تمام مصنفین کے ہاں مشترک ملتی ہے وہ ایک ایسا جذبہ ہے کہ قرآن مجید کو آج کے اس مادی دور میں بطور زندہ کتاب پیش کیا جائے کہ صرف اسی کی روشنی میں زندگی کے گوناگوں مسائل کا حل کیا جا سکے۔

۵۔ فہم القرآن میں اردو زبان میں جتنا کام اب تک شائع ہو چکا ہے۔ عربی زبان کے علاوہ شاید دوسری زبانوں میں اتنا ہوا ہو۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے دوسری اقوام کی نسبت قرآن سے زیادہ اعتناء کیا۔

اس سلسلہ میں ایک تجویز جو دور حاضر کی اہم ضرورت ہے کہ جو حضرات قرآن مجید پر براہ راست تدبر و تفکر کی صلاحیت حاصل کر لیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے براہ راست مطالعہ کی کتاب بنائیں۔ محض عقیدت کی بناء پر کسی مخصوص مفسر کی آراء پر انحصار فکری جمود کا باعث بنتا ہے۔

اسی طرح اس کے برعکس جو لوگ محض تراجم پر اکتفا کر کے یا معمولی عربی زبان کا ذوق پیدا کر کے قرآن مجید کے شارح بن جاتے ہیں، ایسے افراد بھی قرآن مجید کی تفسیر کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے۔ ایسے افراد چونکہ قرآن مجید کی گہرائیوں کو چھو نہیں سکتے لہذا محض اپنی ذاتی ذہانت یا طلاقت لسانی کے بل پر اپنی خود ساختہ کاوش کو قرآن عظیم کی تفسیر گردانتے ہیں، ایسے حضرات کے لیے مناسب ہے کہ وہ اس فن میں ان علماء پر اعتماد کریں جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں اس فن کے لیے وقف کر دیں جن کی نیتوں پر یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محض ذاتی شہرت کے لیے مفسر قرآن بن گئے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین ذہبی، التفسیر والمفسرون، دارالکتب الحدیثہ قاہرہ (۱۹۶۱) ج۱، ص ۶۷

۲۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس نشریات اسلام کراچی(۱۹۸۴) ج۵، ص۱۵۰

۳۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، المکتبۃ العلمیۃ لاہور(۱۹۷۰) ص د

۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۵ ، ص ۵۴۔۱۵۳

۵۔ امیرالدین مہر، برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ، سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد، ج۳۰، ص ۴(اپریل ۔ جون ۱۹۹۳ء) ص ۳

۶۔ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، تذکرہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (طبع اول۱۹۶۵ء) ص ۲۷۰۔۲۶۲

۷۔ عبیداللہ سندھی، القام المحمود، تحقیق ڈاکٹر منیر احمد مغل، مکتبہ رشیدیہ شاہ عالم مارکیٹ لاہور(۱۹۸۳ء) ص ۳۳۲

۸۔ عبیداللہ سندھی ، الہام الرحمان فی تفسیر القرآن ، تحقیق محمد نور مرشد کی، غلام مصطفے قاسمی، طابع الحاج عزیز اللہ عزیز آباد پنو عاقل سندھ (ت ۔ ن)

۹۔ عبیداللہ سندھی ، خلاصۃ القرآن، تحقیق غلام مصطفیٰ قاسمی، طابع عزیز اللہ ، عزیز آباد پنو عاقل سندھ

۱۰۔ سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عبیداللہ سندھی، چند مشاہدات ، روزنامہ نئی دنیا دہلی(مدنی نمبر) ۲۵ نومبر۱۹۵۹ء ص ۱۳۹

۱۱۔ عبید اللہ سندھی، القام المحمود، جزء عم ، انٹرنیشنل بک کارپوریشن ہیر آباد، حیدر آباد سندھ (۱۹۵۹ء) ص ب

۱۲۔ عبیداللہ سندھی، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے، صادق پبلیکشنز اردو بازار لاہور(۱۹۹۰ء) ص ۴۸۔۴۹

۱۳۔ حوالہ سابق ، ص ۲۷

۱۴۔ حوالہ سابق ، ص ۱۷

۱۵۔ عبیداللہ سندھی، شعور و آگہی، عزیز پبلیکشنز میکلوڈ روڈ، لاہور(ت ن) ص ۳۷

۱۶۔ حوالہ سابق ، ص ۱۳۷

۱۷۔ عبیداللہ سندھی شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ، المحمود اکیڈیمی اردو بازار لاہور(ت ن) ص ۴۶

۱۸۔ حوالہ سابق ، ص ۵۳

۱۹۔ حوالہ سابق ص ۵۴

۲۰۔ قاضی عبدالغفار ، آثار ابوالکلام آزاد، گلشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور(۱۹۹۴ء) ص ۹۹۔۱۰۰

۲۱۔ حوالہ سابق ، ص ۱۰۰

۲۲۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن ، اسلامی اکادمی، اردو بازار لاہور(ت ن) ج ۱، ص ۱۴

۲۳۔ حوالہ سابق ، ج ۱ ، ص ۱۵

۲۴۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ابوالکلام آزاد فکر و فن، نسیم بک ڈپو، ۲۵ جی فی مارگ لکھنو(۱۹۸۸) ص ۹۴۔۲۹۳

۲۵۔ ابوالکلام آزاد ، ترجمان القرآن ، ج ۱ ، ص ۱۶

۲۶۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، عبدالماجد احوال و آثار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور(۱۹۹۳ء) ص ۵۷۵

۲۷۔ عبدالماجد دریابادی، دیباچہ تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لاہور(ت ن) ص مقدمہ تفسیر

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی ، عبدالماجد احوال و آثار، ص ۶۱۳

۳۳۔ ماہنامہ معارف ، اعظم گڑھ (مارچ ۱۹۶۹ء) ص ۲۳۲

۳۴۔ سعید احمد اکبر آبادی، فہم القرآن ، اسلامک بک کارپوریشن، اسلام آباد(۱۹۹۲ء) ص ۱۵

۳۵۔ حوالہ سابق ، ص ۴۸

۳۶۔ عبداللہ درخواستی، مقدمۃ الفرقان مع توضیح ام القرآن ، ناشر عبدالقدیر صدیقی، پاور ہاؤس خان پور(ت ن) صفحات ۹۴

۳۷۔ حوالہ سابق ، ص ۶۳

۳۸۔ محمد حنیف ندوی، مطالعہ قرآن ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (۱۹۸۵ء) ص ۵۱۔۳۹

۳۹۔ ڈاکٹر خالد علوی، برہان احمد فاروقی ، پاکستان میں مسلم فلسفہ کی آخری سند، روزنامہ جنگ لاہور، ۶ اگست ۱۹۹۵ء

۴۰۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، منہاج القرآن ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (۱۹۸۶ء) ص ۷

۴۱۔ ڈاکٹر حافظ محمد سلیم ، مفکر قرآن ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ایک عہد ساز شخصیت ، روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اگست ۱۹۹۵ء

۴۲۔ الطاف حسن قریشی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے ایک انٹرویو، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور (جنوری ۱۹۸۰ء) ص ۲۱

۴۳۔ حوالہ سابق ، ص ۲۱

۴۴۔ حوالہ سابق ، ص ۸

۴۵۔ پرویز ، تبویب القرآن ، ادارہ طلوع اسلام گلبرگ ، لاہور (۱۹۸۴ء) ص ۵

۴۶۔ پرویز ، شعلہ مستور، ادارہ طلوع اسلام ، لاہور ، ص ۸۹۔۹۰

۴۷۔ پرویز ، تبویب القرآن ، ص ۷

۴۸۔ پرویز ، مفہوم القرآن ، ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور(ت ن) ص د

۴۹۔ پرویز ، تبویب القرآن ، ص ۷

۵۰۔ پرویز ، مفہوم القرآن ، ص د

۵۱۔ پرویز ، شعلہ مستور، ص ۸۸

۵۲۔ عبدالرحمان طاہر سورتی، ابن مریم اور پرویز ، مکتبہ علمیہ لیک روڈ لاہور(بار اوّل) ص ۲۸

۵۳۔ سیّد ابوالحسن علی ندوی، مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی، مجلس نشریات اسلام کراچی (ت ن) ص ۱۴۹۔۱۶۰

۵۴۔ حوالہ سابق ، ص ۱۷۰۔۱۶

۵۵۔ وحید الدین خان، الاسلام ، المکتبۃ الاشرفیہ ، لاہور(ت ن) ص ۴۔۵

۵۶۔ حوالہ سابق ، ص ۸

۵۷۔ وحید الدین خان، تذکیر القرآن، المکتبۃ الاشرفیہ ، جامعہ اشرفیہ ، لاہور(ت ن) ج ۱، ص ۸

۵۸۔ حوالہ سابق ، ص ۱۱

۵۹۔ حوالہ سابق ، ص ۱۲

۶۰۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور(۱۹۹۲ء) ص ۲۸۔۳۲

۶۱۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، مقدمہ تفہیم القرآن ، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور(۱۹۷۰ء) ج ۱ ، ص ۱۳۔۱۴

۶۲۔ حوالہ سابق ج ۱ ، ص ۱۶

۶۳۔ حوالہ سابق ، ج ۱ ، ص ۸

۶۴۔ حوالہ سابق ، ج ۱ ، ص ۲۳۔۲۱

۶۵۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلامک پبلیکیشنز لاہور(۱۹۹۵) ص ۹۔۱۳

۶۶۔ ثروت صولت ، اہم تصنیفات ، روزنامہ جسارت کراچی(سیّد مودودی نمبر) ۲ جنوری ۱۹۸۰ء ، ص ۱۰۳۔۱۰۴

۶۷۔ سیّد ابوالحسن علی ندوی،عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح، مجلس نشریات اسلام کراچی (بار سوم) ص ۲۰۔ ۱۳

۶۸۔ حوالہ سابق ، ص ۴۱۔۲۱

۶۹۔ وحید الدین خاں ، دین کی سیاسی تعبیر ، المکتبۃ الاشرفیہ، لاہور(ت ن) ص ۱۱

۷۰۔ حوالہ سابق ، ص ۵۸

۷۱۔ امین احسن اصلاحی، مقدمہ تدبر قرآن ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور(۱۹۷۳ء) ج ۱ ، ص ، ش ت ، خ ذ ن

۷۲۔ امین احسن اصلاحی، مبادی تدبر قرآن ، فاران فاؤنڈیشن، اچھرہ لاہور(۱۹۹۱ء) ص ۷۹۔۸۰

۷۳۔ حوالہ سابق ، ص ۱۱۰۔۱۱۳

۷۴۔ خالد علوی، حفاظت حدیث ، المکتبۃ العلمیۃ ، لیک روڈ، لاہور(۱۹۷۱ء) ص ۳۴

۷۵۔ امین احسن اصلاحی ، مبادی تدبر قرآن ، ص ۱۹۱۔۲۰۰

۷۶۔ امین احسن اصلاحی ، مقدمہ تدبر قرآن ، ج ۱ ، ص ح ی

۷۷۔ حوالہ سابق ، ج ۱ ص م ن

۷۸۔ حوالہ سابق ، ج ۱ ، ص ز

۷۹۔ حمید الدین فراہی، نظم قرآن ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور(قرآن نمبر) نومبر ۱۹۶۹ء ، ج ۱ ، ص ۲۹۔ ۲۲۷

۸۰۔ ڈاکٹر اسرار احمد، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر پس منظر، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور(۱۹۹۰) ص ۱۸۲

۸۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن ، ادارہ ترجمان القرآن ، لاہور(۱۹۹۴)، ج ۶ ، ص ۴۶۹۔ ۴۶۲۔ محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن، مکتبہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ (ت ن) ج ۳ ، ص ۳۷۴۔۴۰۰